اردو سفر نامے
کی مختصر تاریخ
مرزا حامد بیگ

اردو سفر نامے کی مختصر تاریخ

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

اورینٹ پبلشرز لاہور

دلّی شہر

اور

ڈاکٹر اسلم پرویز

کے

نام

مندرجات

سفر نامے کا فن

نظری مباحث

مشرق میں "سفر وسیلۂ ظفر" کا تصور قدیم زمانوں سے ملتا ہے۔ گو ہندوستان میں "دھرتی پوجا" نے اس تصور کو سرے سے رد کر دیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اردو میں سید فدا حسین اور یوسف خاں کمبل پوش کے قدیم سفر ناموں سے لے کر دو عشرے پہلے تک ہمارے ہاں سفر نامے کے ساتھ ہندوستانی مزاج کی وہ مطابقت دیکھنے میں نہیں آئی جو بقیہ مشرق اور بیشتر مغربی ممالک میں ملتی ہے۔

ہمارے ہاں مقاماتِ مقدسہ پر حاضری کی روایت البتہ موجود رہی ہے۔ اس قدیمی روایت کے پس منظر میں موجودہ عہد کا بیشتر سفر نامہ 'سفر نامہ' کم اور "ویو کارڈ" زیادہ دکھائی دیتا ہے۔

یونانی مورخ ہیروڈوٹس کو دنیا کا پہلا سفر نامہ نگار کہا جاتا ہے۔ جبکہ مغربی ادبیات میں سفر نامے کی روایت کا سراغ لگاتے ہوئے ہم 13ویں صدی عیسوی تک ہی جاتے ہیں' جب برطانیہ کی اولین سفر نامہ نگار خاتون مارجری کیمپ جو صوفیانہ مسلک کی پابند تھی' 13 ویں صدی عیسوی میں یروشلم تک ہو آئی۔ پھر چوسر کی "کنٹربری ٹیل" ہے' جس میں کنٹربری سینٹ بیکٹ کے مزار پر جانے والا مسیحی قافلہ' ہیری بیلی کو میر کارواں چنتا ہے اور یہ طے پاتا ہے کہ وقت گزارنے کے لئے زائرین میں سے ہر فرد کوئی نہ کوئی کہانی ضرور سنائے' جو نہیں سنائے گا اسے جرمانہ ہو گا۔

اس سفر نامے میں ہمارے ہاں کے میلوں ٹھیلوں کی جانب نکلنے والے جتھوں کی صورت حالات دکھائی دیتی ہے۔ انگریزی کے ابتدائی سفر ناموں میں چوسر کی یہ سفری روداد ناول کے فن سے قریب تر ہے۔ یہ الگ قصہ ہے کہ چوسر یہ معرکہ سر کرنے کے بعد بھی بوکا چیو کی طرح اپنے خدا سے معافی کا خواستگار ہوا کہ شعر و ادب میں پڑ کر وہ اتنی مدت تک اپنے فرائض سے غافل رہا اور گناہ سمیٹا۔

مشرق میں سفر نامے کی روایت' جو مغرب کے مقابلے میں قدیم تر ہے' دو حوالوں سے سامنے آتی ہے۔ اول' عربی ادب میں مقامات کی روایت' جس کی ابتدائی صورت ہمیں

مقامات حریری (عربی) اور بعد میں مقامات حمیدی (فارسی) میں دکھائی دیتی ہے۔ اس روایت کی تکمیلی صورت بوکاچیو کے ہاں پائی جاتی ہے۔ اس روایت کی اساس خطابت اور کھلنڈراپن تھا۔

دوسری روایت "سفر وسیلہ ء ظفر" کی ہے' جس میں حج نامے اور سیاحت نامے لکھے گئے۔ اردو دان طبقہ ایسے قدیم سفر ناموں سے ابن بطوطہ اور ابن جبیر اندلسی کے سفر ناموں سے تراجم کے ذریعے آشنا ہوا۔ اس روایت میں معلومات کا پلہ بھاری ہے۔ ایسے سفر ناموں میں جذبات کا عمل دخل تقریباً نہ ہونے کے برابر دکھائی دیتا ہے۔ محمد حسین آزاد "سیر ایران" اور شبلی نعمانی کا "سفر نامہ ء روم' مصر و شام" اس کی بہترین امثال ہیں۔

برطانوی ادب میں چوسر کی "کنٹربری ٹیل" سے پہلے اسپین کے سفر ناموں کا ترجمہ بہت بڑی تعداد میں ہوا' جس سے انگریزی ادبیات میں سفر نامے کی بطور ایک صنف کے بنیادیں اٹھیں۔ 16ویں صدی عیسوی (الزبتھ اول کا عہد) میں تامس کک اور تامس بیک لوآیٹ نے متعدد سفر اختیار کئے اور سفر کی روداد روز ناموں کی صورت میں لکھی۔ ڈاکٹر جانسن کی "RASSELAS" میں فارس کا ایک شہزادہ بھارت کا سفر اختیار کرتا ہے۔ ڈاکٹر جانسن کے سفر نامے سے ملتی جلتی یہ تحریر اس اعتبار سے خصوصی توجہ کی طالب ہے کہ اس کے بعد انگریزی سفر نامے میں تحیر اور قوت متخیلہ کا عمل در آیا۔ پھر سوئفٹ کی "گلیورز ٹریول" ڈاکٹر جانسن کی رائج کردہ تحیر آفرینی اور قوت متخیلہ کے عمل دخل کو قبول کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی پیروڈی سامنے لائی' حتیٰ کہ فیلڈنگ نے بھی سفر نامے کو مزاحیہ رنگ میں رنگا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر جوزف اینڈریوز نے برملا کہا تھا کہ :-

"نثر میں مزاحیہ ایپک لکھی گئی ہے۔" تقریباً یہی صورت حالات ہومر کے مشہور ایپک "ایلیڈ" اور "اوڈیسی" میں بھی دکھائی دیتی ہے' خصوصاً ٹرائے سے واپسی کا سفر انتہائی غیر سنجیدہ رہتا ہے۔ برطانوی سفر نامے میں یہ سلسلہ آگے چلا' شاید اس کی ایک وجہ ڈکنز کی "اینٹی ہیرو" تحریک ہو یا فیلڈنگ کے ہمہ گیر اثرات۔ جبکہ اس خصوص میں فیلڈنگ کے آخری سفر نامے "جرنی ٹو لزبن" کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ واضح رہے کہ یہ سفر نامہ اس نے مرض الموت میں مبتلا ہوتے وقت تحریر کیا۔ یوں انگریزی ادب میں "Sentimental Jour-ney" کو ہم Stern سفر نامہ نگاروں کا المیہ اور سڈیشن کہہ سکتے ہیں۔

19ویں صدی میں بائرن نے کینٹوز لکھنے کی ابتداء اپنی سفر نامہ نما نظم "چائلڈ ہیرلڈ" سے کی' جبکہ اس کی "ڈان جوآن" کو اس ذیل میں خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اس نظم میں وہ سفر کرتا ہو ابلغاریہ اور ترکی تک نکل آتا ہے اور بھارت جان بوجھ کر نہیں آتا۔

اس لئے کہ وہ سفرنامے کی عام مروجہ ڈگر سے الگ ہٹ کر لکھنا چاہتا تھا۔

مغربی ادبیات میں بھارت کی کشش اس زمانے میں بہت دیکھنے کو ملی۔ اس کی مثال کچھ یوں ہے جیسے بھارت اور روس کے اشتراک سے بننے والی اولین اردو فلم "پردیسی" میں نرگس کی آواز چاردانگ عالم میں گونجتی ہے اور روس سے فلم کا مرکزی کردار (ہیرو) اس آواز کے رخ پر سفر کرتا ہوا بھارت پہنچتا ہے۔

یہ شدید درجے کی کشش 20ویں صدی میں آکر اس وقت دم توڑتی ہے جب مشرق اور مغرب کو باہمی طور پر جاننے پرکھنے کا موقع ملا۔ یوں تھامس مور کی مثنوی "لالہ رخ" میڈوز ٹیلر کے اقبال ٹھگ سے متعلق متعدد ناول اور لارڈ والٹر کے مہماتی ناول بہت دلچسپ صورتِ حال سامنے لاتے ہیں۔

ڈکنز کے ناول "ڈیوڈ کوپر فیلڈ" میں ننھا چہ اپنی واسکٹ بیچ کر سفر اختیار کرتا ہے' بعینہٖ اسکاٹ کے تاریخی ناولوں میں سفر کا استعارہ عجب معنویت کا حامل ہے جو اسپین کے سروانٹس کے سفرنامہ نما داستانوی قصوں کی عطا ہے۔

آخر آخر میں ڈکنز اور سروالٹر اسکاٹ کی عالمگیر شہرت کے ساتھ مشرق اور مغرب' ہر دو اطراف میں باطن کی کائنات کی نسبت خارج سے دلچسپی کا اظہار عود کر آیا۔

خارج سے متعلق بیانیہ اصناف ادب میں سفرنامہ سرفہرست ہے' لیکن شاید سفرنامہ واحد نثری صنفِ اظہار ہے جس کی تکنیکی تعریف کا تعین تاحال ممکن نہیں ہو سکا۔ کچھ یہی سبب ہے کہ سفرنامہ کبھی روزنامچے کے انگ میں لکھا گیا اور کبھی خطوط کی شکل میں۔ اس میں مکالمے کی شمولیت بھی ممکن ہے اور اس میں خبر پہنچانے کا انداز بھی کھپ جاتا ہے۔ پیش منظر کا سفرنامہ اسلوبی سطح پر "نان فکشن" رہتے ہوئے بھی فکشن کا انداز اختیار کر گیا ہے۔ البتہ سفرنامے میں پیش آنے والے واقعات فکشن کی طرح ترتیب نو کے متحمل نہیں ہوتے اور جہاں کہیں بھی ایسا کیا گیا ہے سفرنامہ' ناول یا افسانہ بن گیا ہے۔ سفرنامہ نہیں رہا۔ البتہ سفرنامہ ایک ایسی "نان فکشن" ضرور ہے جس میں ابتداء وسط اور اختتامیہ کی تعمیر میں فکشن کی جھلک ملتی ہے۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ سفرنامے میں ابتداء وسط اور اختتامیہ کی حد تک فکشن کے انداز کی انتخابیت کی اجازت ہے۔ ہمارے ہاں عزیز احمد' شفیق الرحمٰن' سید انور' کرشن چندر اور اے۔ حمید نے سٹیونسن' ڈی ایچ لارنس' سمرسٹ ماہام اور گراہم گرین کی طرح سیاحت کے پس منظر میں ناول اور افسانے لکھے۔ لیکن یاد رہے کہ یہ ناول اور افسانے ہیں سفرنامے نہیں۔ ہمارے ہاں بعض اوقات اس نوع کے افسانوی ادب کو بھی سفرنامے کے ساتھ گڈمڈ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جو کسی طور بھی قابل قبول نہیں۔

سفر نامہ بعض اوقات اپنی حدود کے پھیلاؤ میں آپ بیتی میں بھی ڈھلنے لگتا ہے 'لیکن یہاں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ سفر نامہ آپ بیتی سے جدا کی گئی ایک قاش کے مماثل تو ہے لیکن نری آپ بیتی نہیں۔ عجب معاملہ ہے کہ ہمارے ہاں سفر نامے اور رپور تاژ کا فرق بھی مٹا ہوا ہے۔ حال آنکہ جہاں تک رپور تاژ کی صنف کا تعلق ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ رپور تاژ (Reportage) میں سفر کو بنیاد تو بنایا جا سکتا ہے البتہ اس میں تخیل کی رنگ آمیزی اور خارج سے متعلق اپنے نقطۂ نظر کی تشریح و توضیح اسے سفر نامے سے الگ کر دیتی ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ سفر نامہ واقعات کی تفصیل و تشریح پیش کرتا ہے اور رپور تاژ میں پیش آنے والے واقعات سے لیا گیا تاثر اور اس تاثر کی تخلیقی پیش کش میں خارج کی رپورٹنگ کے ساتھ داخلی عناصر اور تخیل کی رنگ آمیزی اضافی عناصر ہیں۔ رپور تاژ کے یہی چند ہتھیار ہیں جن کے ذریعے مصنف اپنے موضوع کی سماجی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ یوں مولانا محمد جعفر تھانیسری کا " کالا پانی" محمود نظامی کا " نظر نامہ " شاہد احمد دہلوی کا " دلی کی پتا" قدرت اللہ شہاب کا " اے بنی اسرائیل " اور " تو ابھی رہگزر میں ہے " ابراہیم جلیس کا " نئی دیوار چین " سید امجد حسین کا " گواہیں " عرش تیموری کا " ایک سانولا گوروں کے دیس میں " منظور الہی کا " قوس قزح سے فرار " ڈاکٹر وزیر آغا کا " ایک طویل ملاقات " پروفیسر احتشام حسین کا " ساحل اور سمندر " ڈاکٹر عبادت بریلوی کا " ارض پاک سے دیار فرنگ تک " مرزا ادیب کا " ہمالہ کے اس پار " ظفر انصاری کا " پاکستان میں چند روز " ممتاز مفتی کے " لبیک " " ہندیاترا " اور " شاہراہ ریشم " عبد اللہ ملک کا " حدیث دل " اشفاق احمد کے " چھکوہ پاچستان " عرش منور " اور سفر در سفر " اور مختار مسعود کا " سفر نصیب " وغیرہ تحریریں سفر سے متعلق ہوتے ہوئے بھی رپور تاژ شمار ہوں گی۔ جب کہ رپور تاژ کے سفر سے متعلق نہ ہونے کی ایک مثال کرشن چندر کا رپور تاژ " پودے " ہے۔

سو طے پایا کہ رپور تاژ کے لئے سفر ضروری نہیں 'البتہ کسی سفر سے متعلق بھی رپور تاژ لکھنا ممکن ہے جبکہ سفر نامے کے لئے سفر شرط ہے ورنہ ہومر کی " اوڈیسی " بھی سفر نامہ شمار ہوتی۔

مختصراً یہ کہا سکتا ہے کہ سفر نامہ ہر ادب کی ایک مستقل بیانیہ صنف ہے۔ جس میں خارجی مشاہدے کو تخیل پر فوقیت حاصل ہے 'البتہ سفر سے متعلق ہونے کے باعث سفر نامے میں تحیر کا عنصر نمایاں تر ہے۔ لیکن یاد رہے کہ مستقل ادبی صنف ہونے کے ناطے سفر نامے کی پیش کش ادبی نوع کی ہوگی نہ کہ محض مسافر کا بیان۔ اس لئے کہ یہ امر مجبوری

سفر اختیار کرنے والے ہر مسافر کا سفری احوال، ادب کی ایک مستقل صنف سفر نامہ یا سیاحت نامہ نہیں کہلائے گا۔

یوں سفر نامے کی دو قسمیں ہوں گی یعنی (1) ادبی سفر نامہ (2) محض سفری احوال
اس دوسری قسم میں مذید تین اقسام کے سفر نامے دکھائی دیتے ہیں :۔

(1) محض معلومات فراہم کرنے والے غیر تخلیقی انداز کے سفر نامے۔
(2) نجی یاداشتوں کے مماثل سفر نامے، جو آپ بیتی کا خام مواد بن سکتے ہیں۔
(3) اخبارات اور ڈرائنگ روم رسالوں کا پیٹ بھرنے والے چلتر قسم کے سفر نامے، جو محض عشق بازی کے چٹخارے کے لئے لکھے جاتے ہیں یا جغرافیائی معلومات فراہم کرنے کی خاطر یا معاشرت اور حاکم وقت کے تیور بتانے کی خاطر۔ اس طرز کا اولین سفر نامہ شبلی نعمانی کا "سفر نامہ روم و مصر و شام" تھا۔ جس کے ابتدائیہ میں شبلی نعمانی نے سیاسی، انتظامی اور تجارتی حالت کے ساتھ ساتھ نظامِ عدل و تعلیم کی صورت احوال اور تاریخی عمارات کے نقشہ جات کو سفر نامے کے لئے ضروری قرار دیا تھا۔ اس قبیل میں آخر الذکر نوع کا سفر نامہ محمد حسین آزاد کا "سفر نامہ ایران" ہے۔

یاد رہے کہ سفر نامے کی یہ روایت عربی اور فارسی ادب کی عطا ہے نیز اس بھولی بسری روایت کو اردو میں رائج کرنے کی ایک کوشش بھی۔ ان سفر ناموں کا مغربی اثرات کے زیر اثر لکھے گئے سفر نامے سے صرف کلاسیکی وضع کارشتہ ہے، جیسے آزاد کی "نگارستان فارس" کا رشتہ مطالب کے اعتبار سے میجر سر جان میلکم کی کتاب "حالات ایران قدیم" کے ساتھ یا ان سفر ناموں سے جو مستشرقین نے ایران کے بارے میں لکھے۔ خصوصاً معلوماتی سفر ناموں کی حد تک یہ نقش موجود ہے۔

ادبی سفر نامہ لکھنے والوں میں دو طرح کے صاحب قلم دکھائی دیتے ہیں۔

(1) ادیب، جنہوں نے اپنے سفر کے بیانیہ کو بھی بیان کی حد تک تخلیقی نہج عطا کر دی۔
(2) فطری سیاح کے سیاحت نامے۔ واضح رہے کہ مسافر اور سیاح کا سفر سے متعلق انداز نظر یکسر جداگانہ نوعیت کا ہوتا ہے۔ اوپر شبلی نعمانی کا حوالہ دیا گیا تھا، ہم انہیں فطری سیاح نہیں مانیں گے اس لئے کہ ان کے سفر نامے میں سے سیاحت کا عنصر غائب دکھائی دیتا ہے۔

واضح رہے کہ ادبی سفر نامے سے ایک ادبی نثر پارے کا ساحظ اٹھایا جا سکتا ہے۔ یہ تخلیقی سطح کا حظ اس بصیرت کی عطا ہے جس سے عام مسافر یکسر محروم ہے۔

یہاں اس تخلیقی نوع کی بصیرت کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ وہ یوں کہ میرے

نزدیک فطری سیاح اور تخلیقی فنکار کا سفر معمولی سے فرق کے ساتھ گہری مماثلت رکھتا ہے۔اس لئے کہ اس سفر کا محرک تسخیر کائنات ہی کا جذبہ ہے۔ جس کی خاطر سیاح منزلیں مارتا ہوا آگے بڑھتا ہے اور تخلیقی فنکار اس کائنات کے اسرار و رموز کو کھول کر پانی بنانے کی فکر میں ہے۔ گوہر مقصود اپنی ذات میں گم ہو جانے سے حاصل نہیں ہوتا اس کے لئے سفر ناگزیر ہے۔

فطری سیاح (اور ایک حد تک ادیب) قدیم داستانوی ہیرو کی طرح اس جادو نگری کے طلسم یا سحر کو توڑنا چاہتا ہے' جس کے سبب اسے متواتر آگے بڑھنا ہے۔ راہ میں اسے اسیر کرنے کو سیکڑوں کشش انگیز چیزیں آتی ہیں یہ وہ رکاوٹیں ہیں جو حوصلوں کی شکست کا باعث بنتی ہیں۔ لیکن یہاں مرکزی کردار (سیاح یا ادیب) تائید غیبی کے آسرے پر گوہر مقصود کی تلاش میں سرگرداں' ہر روز اس عظیم جوکھم کا احوال رقم کرتا ہے۔ سفر ایک ایسی دیوار ہے جسے مسلسل چاٹنے پر بھی ثابت و سالم ہی پایا گیا۔

فطری سیاح کی نفسیات پر چھان پھٹک کرتے ہوئے ہمارا واسطہ نفسیاتی اصطلاح "Nomadism" سے بھی پڑتا ہے' جو گھٹن کے احساس کی پیداوار ہے۔ یوں مذہب کی تبدیلی اور کاروبارِ حیات میں غیر مستقل مزاجی تک میں' حتیٰ کہ ہجرت کر جانے کے جذبے میں بھی اسی ردِ عمل کی مختلف صورتیں دکھائی دیتی ہیں۔

اب آیئے دائمی ہجرت کے دائرے کی طرف' جس کے اسیر خانہ بدوش ہیں۔ انگلستان اور یورپ کے دیگر ممالک میں خانہ بدوش قومیں ایک زمانے سے گردش میں رہی ہیں۔ سر شیخ عبدالقادر اپنے مضمون "خانہ بدوش جپسی" میں لکھتے ہیں :-

"یہ اقوام زمانہ قدیم میں ہندوستان سے آئی تھیں اور اس وقت تک خانہ بدوش لوگ ہندوستان کے اکثر حصوں میں موجود ہیں۔ وہ ان گورے رنگ والے 'کوٹ پتلون پہنے ہوئے خانہ بدوش جپسیوں کے چچیرے بھائی ہیں"۔ انہیں ہمارے ہاں سندھ میں "بھیل" اور پنجاب میں "جھگیوں والے" یا "ٹپری واس" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ان کے مشرقی خدوخال کی بنا پر مغرب میں مصری سمجھا گیا۔ شاید اسی لئے وہاں ابتداء میں انہیں "اجپسی" پکارا گیا۔ بعد میں یہ لفظ گھٹتے گھٹتے "جپسی" رہ گیا۔

یہ لوگ ہندوستان سے بہ منازل مغرب تک پہنچے اور ایران سے "فارسی" روم سے "رومن" مصر سے "قبطی" عرب سے "عربی" اسپین سے "سپانوی" جرمنی سے "جرمن" اور آسٹریا سے "آسٹرین" زبانوں کے پھول چنتے پھرے۔ سر والٹر اسکاٹ کے افسانوی ادب میں یہی خانہ بدوش نجوم کا احوال بتاتے اور فال نکالتے دکھائی دیتے ہیں۔ یاد

رہے کہ یہ خانہ بدوش یورپ میں بھی پانی کو "پانی" مونہہ کو "مو" چور کو "چور" اور چومنے کو "چومیا" کہتے آئے ہیں۔ جپسی لوگوں کی زبان میں کچھ الفاظ مثلاً "تتو" بمعنی گرم اور "جیب" بمعنی "زبان" جیسے الفاظ پر ڈاکٹر گریئرسن نے ہندوستانی لسانیات کے باب میں تفصیل سے بات کی ہے۔

مشرق اور مغرب ہر دو اطراف میں ان خانہ بدوش اقوام کی بولی لوگ نہیں سمجھ پاتے اور وہ پردے کی باتیں سب کے سامنے کرتے پھرتے ہیں۔ سب سے مزے دار بات یہ کہ ان خانہ بدوشوں کے اکثر بول چال کے الفاظ نامعلوم طور پر مشرق و مغرب کی گرانڈیل زبانوں پر بھی اثر انداز ہوتے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔ مثلاً "چیز" خانہ بدوشوں میں بمعنی "شے" کے مروج تھا۔ ہمارے ہاں پنجابی اور اردو میں بھی ہے اور اب انگریزی میں بمعنی عمدہ اور اول درجے کی چیز کے مستعمل ہے۔

سر شیخ عبدالقادر نے اپنے محولہ بالا مضمون میں انگریزی کی بازاری زبان سے متعلق "The Slang Dictionary" کا حوالہ دیا ہے جسے "Chatto & Windus, London" نے شائع کیا تھا۔ اس ڈکشنری میں خانہ بدوشوں کی عام بول چال کے الفاظ و محاورات کی ایک جامع فہرست دی گئی ہے اور خانہ بدوشوں سے متعلق بعض عجیب و غریب معلومات درج ہیں۔ مثلاً یہ کہ ان کی اپنی ایک خاص قسم کی تصویری زبان بھی ہے' جسے صرف وہی سمجھتے ہیں۔ چند اشاروں سے خانہ بدوش خفیہ زبان کا کام بھی لیتے ہیں مثلاً یہ کہ کدھر جانا مفید ہوگا اور کدھر مضر' یا کس شخص سے ملے گا اور کہاں کہاں خطرہ ہے وغیرہ۔

یہاں ان نشانات میں سے چند کا نقل کر دینا خالی از لطف نہ ہوگا۔

1- بہت غریب اور شکی...... یعنی کسی کام کے نہیں — X

2- اپنے مطلب کا مال خریدنے والی اسامی...... لیکن مول تول ہشیاری کے ساتھ کرنا ہوگا۔ — ~+

3- کچھ نہ کچھ ملنے کی توقع ہے۔ لیکن زیادہ باتیں نہ بنایئے گا۔ — ◇

4- یہاں بہت سائلوں کے آنے سے کام بگڑ گیا۔ — ▽

5- کتے سے جان بچانا۔ یہ مکان بھی مایوس کرنے والا ہے۔ — □

6- اگر یہاں گئے تو جیل میں سڑتے رہو گے۔ خطرہ — ⊙

سر شیخ عبدالقادر لکھتے ہیں کہ ان نشانات کے لئے اصطلاحی نام بھی موجود ہیں۔ محولہ

بالا ڈکشنری میں ایک ترکیب راز کی باتیں کرنے کی بھی لکھی ہے، اور وہ یہ کہ بولتے وقت حروف کی ترتیب بدل دی جائے مثلاً ''مٹن چاپ'' کو ''چٹن ماپ'' کہو۔ یہ رواج ہمارے ہاں بھیل خانہ بدوشوں میں بھی بعینہٖ موجود ہے۔ اسی طرح جپسی خانہ بدوشوں میں ایک رواج اور ہے جو ہندوستان کے ایک رواج سے بہت مشابہ ہے، یعنی بولتے وقت ہر لفظ کی ادائیگی پر کوئی ایک زائد حرف کا اضافہ کر کے اس کی صورت مسخ کر دی جائے۔ ہمارے ہاں پنجاب میں بچے یہ مرموز زبان ''میں تینوں کہناہاں'' کی جگہ ''مفیں تفینوں کفہنا ہفاں'' بولتے ہیں۔

ڈی کوئنسی ایک جگہ لکھتا ہے کہ اس کے زمانہ طالب العلمی میں ونچسٹر کالج کے طلبہ خاص طور پر اس نوع کی بولی میں مشاق تھے۔ چنانچہ ڈی کوئنسی نے بھی اسے سیکھا اور کوئی پچاس برس بعد اسے لارڈ وسٹ پورٹ کے ساتھ اسی زبان میں گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا۔ برطانیہ میں اس زبان کا اصطلاحی نام ''زف'' ہے۔

سو آپ نے ملاحظہ کیا کہ خانہ بدوش سیاح زبانوں اور تہذیب منطقوں میں بھی کس قدر دخیل ہیں۔

اب آیئے سفرنامے کے انداز تحریر کی طرف۔ جیسا کہ اُوپر بیان کیا گیا ہے، سیاحت کے ثمرات، تجربات اپنا انعام آپ ہیں۔ اسی لیے سفر کا بیان مونہہ بسورنے اور نالہ وفریاد کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ تخلیقی سفرناموں کی شگفتہ بیانی، راضی بہ رضا ہونے کی علامت ہے۔ فطری سیاح اپنے منتخب کردہ پرصعوبت صفر کے مآل پر راضی بہ رضا ہی ہوتا ہے۔ سو طے پایا کہ اس کے لیے شگفتہ اور سبک انداز تحریر مناسب ہے، لیکن نہ اتنا کہ پھکڑ بازی کی حدوں کو چھونے لگے۔

داستانوی حوالے سے گوہر مقصود کی بات ہوئی تھی۔ تخلیقی سفرنامے کا گوہر مقصود اس تخلیقی حظ کا حصول ہے، جو مثنوی ''گلزار نسیم'' کے ہیرو کو بکاؤلی کے پھول تک رسائی حاصل کرنے سے نصیب ہوا تھا۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ گائیڈ بک، ٹریول بک اور ڈاکومنٹری فلمیں اس تخلیقی سفر کا متبادل نہیں مانی جاسکتیں۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ سفرنامے میں جو کچھ ٹریول بک طرز کے بغلی راستوں سے حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے وہ قاری کو سوائے کسی علاقے سے متعلق کھردری معلومات پہنچانے کے اور کچھ نہیں۔ اس نوع کے بغلی راستے تائید غیبی کی مسرت و بہجت سے عاری ہوتے ہیں شاید یہی سبب ہے کہ آج 1999ء میں اُردو نامے کی عمر ایک سو ساٹھ برس ہونے کو آئی لیکن تاحال تخلیقی سفرناموں کو انگلیوں پر گنا جائے تو دوسرے ہاتھ کی دو ایک انگلیاں پھر بھی بچ رہتی ہیں۔

☆☆☆☆

ہندوستان سے متعلق قدیم سفر نامے اور تراجم

قدیم سفر ناموں کی کھوج میں نکلیں تو ہندوستان سے متعلق لکھے گئے سفر ناموں میں "سفر نامۂ ہند" تک جا نکلتے ہیں۔ یونانی سیاح میگا تھنز کا یہ سفر نامہ دنیا کے قدیم ترین سفر ناموں میں شمار ہوتا ہے۔ میگا تھنز تین سو قبل مسیح میں ہندوستان کے مہاراجہ چندر گپت موریہ کے دربار (دارالسلطنت پٹنہ) میں بطور یونانی سفیر حاضر ہوا اور ہندوستان میں اپنے قیام کی روداد سفر نامے کی صورت میں لکھی۔ قیاس غالب ہے کہ سکندرِ اعظم نے ہندوستان پر حملہ کرنے کے لئے اسی سفر نامہ سے حاصل کردہ معلومات کو بنیاد بنایا۔

اوائل پانچویں صدی عیسوی (راجہ بکر ماجیت کے عہد حکومت) میں چین کا ایک سیاح فاہیان، بدھ رہبانیت کی نشانیوں کو محفوظ کرنے کی خاطر ہندوستان آیا اور اپنی یادداشتیں یادگار چھوڑیں۔

ساتویں صدی عیسوی (راجہ ہر لیش چندر کے عہدِ حکومت) میں ایک اور چینی سیاح ہیون ٹی سنگ (یوانگ چوانگ) ہندوستان آیا۔ اس نے اپنا سفر نامہ مرتب کرتے وقت انتظامی امور کے علاوہ پہلی بار ہندوستان کی عوامی زندگی کو اپنا موضوع بنایا۔ اس سفر نامے کا اولین اردو ترجمہ "سفر نامہ ہیونگ ٹی شیانگ" کے نام سے پنجاب ریلیجیس بک سوسائٹی لاہور نے 1909ء میں شائع کیا۔ اس سفر نامے کا دوسرا ترجمہ "ہندوستان پر چینی سیاح کے خیالات" کے نام سے نیر بک ایجنسی مراد آباد نے شائع کیا جس پر سنہ طباعت درج نہیں کل صفحات 298 ہیں۔ اس سفر نامے کا تیسرا ترجمہ "چینی سیاح کا سفر نامہ" کے نام سے مترو بک کمپنی لاہور نے 1920ء کے لگ بھگ شائع کیا۔

ایرانی سیاحوں میں اصفہان کا حکیم ناصر خسرو پہلا سیاح دکھائی دیتا ہے، جو 1040ء تا 1052ء میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے کے بعد قاہرہ، اسکندریہ، بیت المقدس، حلب، بغداد، کربلا، نجفِ اشرف، کاظمین اور دمشق کی سیر و سیاحت میں مصروف رہا

اور تقریباً نو ہزار میل کے سفری تجربات اور مشاہدات کو "دار المسافرین" کے نام سے قلم بند کیا۔ اس سفرنامے کا اردو ترجمہ مولوی عبدالرزاق کانپوری نے کیا ہے۔

دوسرا مسلمان سیاح طنجہ مراکش کا باشندہ شیخ ابو عبداللہ المعروف ابنِ بطوطہ ہے۔ اس نے 1325ء میں اپنے سفر کا آغاز کیا اور حجاز' مصر' شام' عراق' ترکی' ایران' بخارا' بدخشاں' افغانستان اور ہندوستان کے سفری تجربات و مشاہدات کو "عجائب الاسفار" کے نام سے قلم بند کیا۔ اس سفرنامے کا اولین اردو ترجمہ پیرزادہ محمد حیات الحسن نے "سفرنامہ ابنِ بطوطہ" کے نام سے کیا جو پہلی بار امرتسر سے 1901ء میں شائع ہوا۔ اس سفرنامے کا تیسرا ترجمہ دورِ جدید میں رئیس احمد جعفری نے کیا ہے۔

مسلم سیاحوں میں ایک اور قدیم نام غرناطہ کے ابنِ جبیر اندلسی کا ہے جس نے 1185ء میں "ابنِ جبیر کا سفر" کے نام سے سفرنامہ مرتب کیا۔ ہندوستان سے متعلق "تزکِ بابری" بھی قدیم سفرناموں میں شمار ہوگا۔ اس کے ایک سے زائد تراجم سامنے آچکے ہیں۔ ہندوستان سے متعلق یورپی سیاحوں کے قدیم سفرناموں میں مارکوپولو کا نام بہت نمایاں ہے۔ وہ لگ بھگ چالیس برس تک براعظم ایشیاء کی سیر و سیاحت میں مصروف رہا۔ وہ غیاث الدین بلبن کے عہد حکومت (1265 تا 1287) میں چین سے مالابار تک آیا اور کئی برس تک یہاں مقیم رہا۔

ہندوستان کی طرف بڑھنے والا دوسرا یورپی سیاح بارتھولوموڈاز ہے جس نے 1486ء میں پرتگالی بادشاہ کے حکم پر لزبن سے ہندوستان کی طرف سفر اختیار کیا اور افریقہ کے مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف بڑھا لیکن سمندری طوفان نے اس کے حوصلے پست کر دیئے اور وہ واپس لوٹ گیا۔ 1492ء میں اسپین کے بادشاہ نے اس مہم کو سر کرنے کی خاطر کرسٹوفر کولمبس کو روزانہ کیا لیکن کولمبس نے کسی غلط فہمی کی بنیاد پر جنوب کی بجائے مغرب کا رخ کر لیا اور یوں امریکا دریافت ہوا۔ اس مہم کی تیسری کڑی 1498ء میں پرتگال کے بادشاہ کے حکم کے مطابق واسکوڈے گاما کا ہندوستان کی طرف سفر ہے۔ واضح رہے کہ 28 مئی 1498ء میں جب واسکوڈے گاما' مالابار (ہندوستان) کے ساحلی علاقے پر اترا تو اس کے ساتھ ایک سو ساٹھ دیگر افراد بھی تھے۔ واسکوڈے گاما اور اس کے دیگر ساتھی یہاں ایک برس تک مقیم رہے۔

اس دور کے غیر ملکی سیاحوں کے لکھے سفرناموں میں درج ذیل سفرنامے اور ان سے

متعلق کتب حد درجہ اہم ہیں :۔

1- "اکاؤنٹ آف انڈیا" از Pe Leat
2- "کنٹری" از Monserrate
3- "جہانگیر ز انڈیا" از Pelsaeri
4- "ہسٹری آف دی مغل انڈیا" از Pelsaeri
5- "Early Travels In India" از Foster
6- "A Voyage To East India" از Eaward Terry
7- "سفر نامہ" از Peter Dellavalle
8- "Travels In India" از Jean Baptist
9- "سفر نامہ" از Peter Mundy
10- "اکبر اور عیسائی" از De Jarric
11- "جہانگیر اور عیسائی" از Guerriro
12- "سفر نامہ" از سر ٹامس ہربرٹ
13- "Account of his Mission and Travels" از Manrique
14- "Voyage" از Middleton
15- "Account of Travels of George" از Ardries
16- "General Discription of India" از Van Twist
17- "Story of Moghal India" از Manucci

اس کتاب کا اطالوی زبان سے انگریزی ترجمہ اروِن نے کیا تھا۔ جب کہ اردو میں اس کتاب کے تین ترجمے یادگار ہیں۔

18- "سفر نامہ ہند" المعروف "وقائع سیاحت برنیر" از ڈاکٹر فرانسس برنیئر
19- "سفر نامہ" از Trvernier
20- "سفر نامہ" از ہملٹن
21- "سفر نامہ" از مور کرافٹ
22- "سفر نامہ" از بیرن ہوگل

اس کتاب کا جرمن زبان سے انگریزی ترجمہ مسٹر جورس نے کیا تھا۔

23- "سفر نامہ" از ڈاکٹر مارٹن برگر

24- رچ مانڈ بر اڈ فٹ لاہور میں" از　　ظہیر الحسن

25- "ابتدائی غیر ملکی سیاح" از　　ای۔ڈی میکلیگن

یہ مضمون "جنرل آف دی پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی" لاہور میں 1912ء میں شائع ہوا۔

26- "جے سوٹ (Jesuit) مشن لاہور میں" از فادر فلیکس

یہ مضمون "جنرل آف دی پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی" لاہور میں 1916ء میں شائع ہوا۔

ایک زمانہ تھا جب کالی کٹ کی بندرگاہ پر دیگر مغربی اقوام کا جمگھٹا سا رہنے لگا جب کہ عرب تاجر اس کے علاوہ تھے۔ پرتگالی تاجروں کے قافلے الورز کابرل (ستمبر 1500ء) اور الفانسوالبورک کی راہنمائی میں ہندوستان آتے رہے۔ ان میں سے اکثر افراد نے ہندوستان سے متعلق سفر نامہ نما تحریریں یادگار چھوڑیں۔ خصوصاً اس ضمن میں اولین پرتگالی وائسرائے فرانسکوا۔میڈیا (1505ء) کے سرکاری خطوط اور یادداشتیں توجہ کی طالب ہیں۔

برطانوی کپتان ہاکنس 1608ء میں جہانگیر کے لئے شاہِ انگلستان کا ایک خط اور قیمتی تحائف لے کر ہندوستان وارد ہوا اور اسی سال ایسٹ انڈیا کمپنی کی اولین تجارتی کوٹھی (بمقام سورت) قائم کرنے کی اجازت حاصل کر لی۔ 1615ء میں سر ٹامس روبر طانوی سفیر کے طور پر ہندوستان آیا۔ ان ہر دو افراد کی یادداشتیں سفر نامے کے ضمن میں تاریخی اہمیت کی حامل ہیں۔

مشہور فرانسیسی سیاح ڈاکٹر فرانسس برنیئر 1656ء تا 1668ء ہندوستان میں قیام پذیر رہا۔ ہندوستان سے متعلق اس کے ضخیم سفر نامے کا اولین اردو ترجمہ "وقائع سیر و سیاحت" کے نام سے سابق وزیر اعظم پٹیالہ سید محمد حسین نے دو جلدوں میں کیا ہے۔ یہ ترجمہ اول اول مراد آباد سے 1888ء میں طبع ہوا اور اس کا دوسرا ایڈیشن 1903ء میں آگرہ سے چھپا۔

مشہور اطالوی سیاح نکولائی مانوچی کی ہندوستان آمد کا بھی یہی زمانہ ہے۔ مانوچی نے اورنگ زیب عالمگیر کے دورِ حکومت کی درباری اور محلاتی زندگی کی تصویر کشی کچھ اس ڈھب سے کی ہے کہ اورنگ زیب سے جذباتی وابستگی رکھنے والا مسلم طبقہ مانوچی سے شدید نفرت کا اظہار کرتا چلا آیا ہے۔

نکولائی مانوچی کے سفر نامے کے اردو میں تین ترجمے ہوئے ہیں، جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

1- "فسانہء سلطنت مغلیہ" از سید مظفر علی، مطبوعہ "آگرہ اخبار" لودھ لکھنو (س۔ن)
2- "ہندوستان عہد مغلیہ میں "از ملک راج شرما' مطبوعہ ناولسٹ ایجنسی لاہور (س۔ن)
3- "داستان مغلیہ "(سفرنامے کے چیدہ حصوں کا ترجمہ) از سجاد باقر رضوی

مطبوعہ نگارشات' لاہور

اوائل 18 صدی عیسوی میں برطانوی پادری مشن بنگال (ہندوستان) آنا شروع ہو گئے تھے۔ پادری تھامس دوبار جہاز "آکسفورڈ" کے ذریعے بحیثیت طبیب ہندوستان آچکا تھا۔ وہ تیسری بار مشہور پادری ولیم کیری اور اس کے ساتھی وارڈ کے ساتھ 11 نومبر 1793ء میں ہندوستان آیا۔ تھامس' ولیم کیری اور وارڈ کے خطوط اور ڈائریوں سے عجیب و غریب سفرنامے مرتب ہو سکتے ہیں۔ ولیم کیری ہندوستان پہنچ کر اپنی ڈائری میں لکھتا ہے۔

"اس وقت میری نظروں کے سامنے ایک ایسا ملک ہے جو دنیا کے بہترین ممالک میں شمار کیے جانے کے لائق ہے۔ اس میں محنتی اور جفاکش لوگ بستے ہیں لیکن اس ملک کے پانچ حصوں میں سے تین حصے جنگل ہی جنگل ہیں۔ جن میں کسی قسم کی کاشت نہیں ہوتی۔ ان جنگلوں میں سانپ اور درندے وغیرہ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اگر یہاں انجیل نے اپنا کام کیا تو گویا بیابان شاداب میدان بن جائے گا۔"

(بہ حوالہ "ولیم کیری" از ایس۔ ایم سنگھ)

1821ء میں وارڈ کے چند خطوط کا ایک کتابچہ برطانیہ سے شائع ہوا تھا' جس میں وہ لکھتا ہے :

"جب ہمارے ساتھی بنگال میں جہاز سے اترے تو انہوں نے تقریباً ایک لاکھ نفوس کے درمیان بود و باش اختیار کی (ان میں مسلمان شامل نہیں تھے) ان لوگوں سے جب مذہبی معاملات پر گفتگو کی جاتی تھی تو یہ تینتیس کروڑ دیوتاؤں کا ذکر کرتے تھے۔ یہ تھی ان کی بت پرستی کی حالت۔ اس پر طرفہ یہ کہ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ توحید الٰہی کے قائل ہونے کا دعویٰ بھی کرتے تھے۔"

دیگر مغربی سیاحوں میں سر فرانسس ڈریک' کپتان کک اور چارلس سٹرٹ کے نام نمایاں تر ہیں۔

ہندوستان میں آکر اقامت پذیر ہو جانے والے قدیم صوفی بزرگوں کی تحریریں اس کے علاوہ ہیں' خصوصاً ملفوظات فرید گنج شکرؒ' ملفوظات قطب عالم گجراتیؒ' ملفوظات شیخ محمد غوث گوالیاریؒ اور ملفوظات شیخ بادلؒ کے علاوہ میراں جی خدا نماؒ' شاہ ابوالحسنؒ اور برہان الدین

جانم" کی متعدد مثنویوں اور "دیوانِ شاکر" از محمد عبد الشکور شاکر ایکیؒ میں سفر نامے کا عنصر غالب ہے۔

یہ تو ہوئی ہندوستان سے متعلق قدیم ملفوظات اور سفر ناموں کی بات۔ انگریزی سے اردو میں منتقل ہونے والے سفر ناموں کی فہرست بھی خاصی طویل ہے' ملاحظہ فرمائیے۔

1- "سفر نامہ ایران" طبع اول مطبع حمید پریس لاہور' 1906ء
جنرل تامس ایڈورڈ گارڈن / محمد انشاء اللہ طبع دوم قریشی بک ایجنسی لاہور' 1923ء سے قبل

2- "اعمال نامۂ روس"
ڈاکٹر وی میکنزی / پنڈت رتن ناتھ سرشار مطبوعہ نول کشور لکھنؤ طبع اول 1887ء ص 1282

3- "اسٹینلے سیاح افریقہ"
ہنری۔ ایم اسٹینلے / نام مترجم ندارد مطبوعہ مطبع فیض بخش اسٹیم پریس
فیروزوزپور 1908 صفحات 83

4- "سفر نامہ منگوپارک"
منگوپارک / نام مترجم ندارد مطبوعہ کلکتہ اسکول بک سوسائٹی طبع اول 1850ء

5- مختصر سیر انگلستان" طبع دوم: 1853ء
ن۔ ن / نام مترجم ندارد مطبوعہ نول کشور لکھنؤ (1923 سے قبل) صفحات 480

6- "ارژنگِ فرنگ"
ن۔ ن / نام مترجم ندارد مطبوعہ کتاب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن (1923 سے قبل)

7- "وقائع نگار انگلستان"
کالیر / نام مترجم ندارد مطبوعہ مفید عام پریس آگرہ صفحات 4000 سے زائد
طبع دوم لکھنؤ 1872 صفحات 474؛

8- "سفر نامہ پرنس آف ویلز صاحب بہادر"
پرنس آف ویلز / صاجزادہ محمد مصطفیٰ علیخان مطبوعہ نول کشور لکھنو صفحات 298

9- "سیاحت ٹیونیر"
جے۔ بی ٹیونیر / نام مترجم ندارد مطبوعہ مفید عام پریس آگرہ 1896ء صفحات 166

10- "لیڈی ڈفرن کی چند روزہ سیر حیدر آباد

لیڈی ڈفرن / محمد مظہر　　　مطبوعہ　　　انجمن ثمرۃ العلوم : تاج پریس حیدرآباد دکن 1886ء

11- "قطبی برفستان"

رسل اوون مرتضی احمد خان میکش　　　مطبوعہ　　　مجلس ترقی ادب لاہور 1963ء

12- "داستانِ مغلیہ"　　　مطبوعہ　　　نگارشات' لاہور (اس کتاب کے دیگر دو ترجمے

نکولائی مانوچی / سجاد باقر رضوی　　　ملک راج شرما اور سید مظفر علی نے کئے تھے)۔

13- "سفرنامۂ انگورہ"

فرانسیسی خاتون / آغا رفیق بلند شہری کتاب 1939ء سے قبل شائع ہوئی۔

14- "سفرنامۂ شہنشاہ جرمن"　　　مطبوعہ　　　مطبع احمد ' رام پور۔ 1900ء

شاہ جرمنی / احمد علی خان شوق

15- "گلشت فرنگ یعنی میرے روزنامچہ یورپ سے چند صفحے"

نواب فتح نواز جنگ / مولوی محمد عزیز مرزا مطبوعہ　　　مفید عام پریس آگرہ 1889ء

نمونہ عبارت ملاحظہ ہو

"10 فروری' آخر کار میری روانگی کا دن آپہنچا' اسباب صبح ہی سے درست کر لیا تھا دو بجے کوک کے لوگوں نے جہاز پر رکھدیا' شام کے تین بجے دوستوں کے ساتھ ہوٹل سے روانہ ہوئے اور سوا تین بجے دخانی کشتی پر سوار ہوئے تھوڑی دیر کے بعد ہی کیا دیکھتے ہیں کہ ایک عالی شان جہاز پر کھڑے ہوئے ہیں۔ مجکو ہوتی ہے کہ مہذب قوموں میں علم کو کس قدر ترقی ہوئی ہے۔ فن جہاز رانی تو خصوصا ترقی کے درجہ کمال پر پہنچ گیا ہے۔ سمندر میں جہاز کا ٹھیک مقام اس آسانی اور صحت سے دریافت کر لیتے ہیں جیسے کیسی گھوڑا گاڑی کا کرہ زمین پر۔ کپتان نے مجھ سے بیان کیا کہ اگر اس ساحل کے پاس کوئی چیز پھینک دی جائے اور عدن میں جا کر کسی جہاز کے کپتان سے کہدوں تو وہ اس کو نہایت آسانی سے نکال لے گا۔ جب کہ برقی تار سمندر کی تہ میں ٹوٹ جاتا ہے تو تار والے تسلسل برقی کے امتحان سے فوراً دریافت کر لیتے ہیں کہ کہاں ٹوٹا ہے۔ اور جہاز بھیج کر جوڑ دیتے ہیں۔

24 اکتوبر :۔ آج ہم نیپلز کی خوشنما مضافات کو دیکھنے گئے شہر سے دو میل چل کر ایک لمبے تہ زمین کے پل میں داخل ہوئے جس کا نام گروٹوڈی پاس لیپو ہے۔ اس پل کا نصف میل طول ہے اور پہاڑ کاٹ کر بنایا ہے۔ قدیم رومیوں کی صناعی کا ایک عمدہ ثبوت ہے۔ پل سے نکل کر ہم نے بہت سے رومی مکانات دیکھے' وہاں سے لاگوڈی اگین تو کی طرف گئے جو

پہلے ایک پر فضا جھیل تھی مگر اب خشک پڑی ہے۔ یہاں بھی ایک کھوہ ہے جس کا نام گروٹوڈوکان ہے' اس کے اندر زمین سے کوئی دو فٹ اونچا ایک نشان ہے جس کی نسبت یہ مشہور ہے کہ اس سے نیچے ہوا میں سمیت ہے۔ ہمارے رہبر کے ہاتھ میں ایک مشعل تھی اس نے امتحاناً اس کو نشان سے نیچے کیا فوراً گل ہو گئی۔ مجھ سے بعض لوگوں نے یہ بھی کہا کہ ہم ایک کتے پر اس کا تجربہ کر کے آپ کو دکھلاتے ہیں وہ بے ہوش ہو کر گر پڑے گا لیکن میں نے ایسے ظالمانہ اور بے فائدہ تجربے کی اجازت نہ دی۔"

یہ اقتباس سفر نامے کے آخر سے لیا گیا ہے۔ "التماس مترجم" سے پتا چلتا ہے کہ 10 فروری تا 24 اکتوبر 1888ء نواب فتح نواز جنگ کو سفر نامہ لکھنے کی فرصت نہ ملی اور وہ جنوری 1889ء کو حیدر آباد لوٹ آئے۔

16- "پروفیسر وسمبری کا سفر نامہ"
پروفیسر وسمبری / محبوب عالم　　مطبوعہ پیسہ اخبار لاہور 1903ء صفحات 300

17- "سیاحت قسطنطنیہ"
مسز میکس ملر / سید رشید الدین　　مطبوعہ آگرہ 1903ء

18- "مشرقی ترکستان"
سر آورل آسٹن / سید محمود اعظم فہمی مطبوعہ دائرہ ادبیہ لکھنو (س۔ن)

19- "سفر دار المصطفےٰ"
آر۔ ایف برٹن / محمد انشاء اللہ　　مطبوعہ حمیدیہ اسٹیم پریس لاہور طبع اول اپریل 1910ء

20- "سیر تبت"
احمد شاہ / انیس شاہ　　مطبوعہ مخزن پریس دہلی 1909ء

21- "حج زینب"
لیڈی ایولن کیولڈ زینب / محسن شبیر مطبوعہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن 1941ء

22- "تزک جرمنی"　　مطبوعہ نول کشور 1876ء صفحات 76
پرنس البرٹ / پنڈت بشمبر ناتھ
فنون

23- "سیاحت موسیو تھیونو"
موسیو تھیونو / مترجمین سر رشتہ　　مطبوعہ مفید عام پریس آگرہ 1896ء
حیدر آباد۔ دکن۔ جلد دوم'　　مطبوعہ　　1897ء

24- "سیکی کا سفر"
جان ڈیمن/ ٹی۔ ہیری ویونس سنگھ مطبوعہ پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی لاہور 1920ء
25- "سفر نامہ حجاز"
جان لوئس بر کھارٹ/ نام مترجم ندارد مطبوعہ دار الترجمہ عثمانیہ حیدر آباد دکن
مطبع : تاج پریس، حیدر آباد طبع اول : 1925ء
26- "آئینہ عبرت"
مسز ہنری لووڈ/ خجستہ اختر بانو، مطبوعہ حبل المتین پریس کلکتہ طبع اول :1910ء
27- "سفر نامہ بلوقیا"
نام مصنف ندارد/ مولوی عبد الاول مطبوعہ صدیق بک ڈپو، لکھنو
28- "سفر نامہ حجاز"
جان لوئس بر کھارٹ/ علی شبیر مطبوعہ تاج پریس حیدر آباد دکن 1324ھ مطابق 1906ء
29- "سفر نامہ حجاز"
کرنل شاہ بیگ/ محمد فاضل مطبوعہ اسلامیہ پریس، لاہور
30- "سفر یا قند"
ٹی۔ ڈی فورسیا تھ/ نام مترجم ندارد مطبوعہ لاہور طبع اول : 1871ء
31- "سیاح جرمنی"
الگزینڈر ہمبولڈ/ نام مترجم ندارد مطبوعہ خادم التعلیم پریس : پیسہ اخبار لاہور : 1895ء
32- "عہد حکومت السلطان عبد الحمید خاں ثانی الغازی ٹرکی"
شنرلوی این۔ ڈی لوسکال/ محمد انشاء اللہ، مطبوعہ اخبار وطن حمیدیہ پریس لاہور، 1893ء
33- "فسانہ سلطنت مغلیہ"
نکولائی مانوچی/ مظفر علی خان مطبوعہ آگرہ اخبار اودھ لکھنو، س۔ن ص ۶ ۷ ۳
34- "قسطنطنیہ"
نام مصنف ندارد/ محمد انشاء اللہ، مطبوعہ لاہور، 1939ء سے قبل شائع ہوا
35- "کمال ٹرکی"
میجر جنرل ٹاؤن شنڈ/ مولوی معین مطبوعہ 1939ء سے قبل شائع ہوا

36- "گاندھی جی بادشاہ خاں کے دیس میں"

پیارے لعل/ڈاکٹر عابد حسین، مطبوعہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی، 1950ء

37- "مادر انڈیا"

مس کیتھرائن مئیو/محبوب عالم مطبوعہ پیسہ اخبار لاہور 1939ء سے قبل شائع ہوا

38- "مادر ہند"

مس کیتھرائن مئیو/خالد کے بیگ مطبوعہ 1939 سے قبل

39- "مدر انڈیا"

مس کھترائین مئیو/نام ندارد، مطبوعہ سول ایجنٹ نیرنگ خیال لاہور طبع اول 1933ء

40- "ہندوستان عہد مغلیہ میں"

نکولائی مانوچی ملک راج شرما مطبوعہ ناولسٹ ایجنسی لاہور

41- "ماؤزے تنگ کے دیس میں"

کارلو سائیگو/جیلانی مطبوعہ مکتبہ چراغ نو لاہور

42- "محشرستانِ آئرلینڈ"

ڈی ویرا/احمد سعید خان شوق

43- "مغربی تبت"

شیرنگ/نام ندارد، مطبوعہ نول کشور لکھنو

44- "وقائع سیر و ساحت ڈاکٹر برنیئر" دو جلدیں

ڈاکٹر برنیئر/خلیفہ سید محمد حسین و مطبوعہ مفید عام پریس آگرہ 1321ھ

کرنل ہنری مور

(نوٹ) یہی ترجمہ 'سفرنامہ برنیئر (کامل) کے نام سے بھی شائع ہوا۔

45- "ہلال کے سائے میں"

ہنری گبس/ڈاکٹر عبدالسلام خورشید مطبوعہ تعمیر پرنٹنگ پریس 1953ء

46- "یہ امریکہ ہے"

ڈاک ماری تان/محمود مسعود، مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی ص 188

47- "یہ روس ہے"

اسٹیونس اینڈ منڈ/نام ندارد مطبوعہ پروگریسو پبلیشرز: نعمانی پریس دہلی ص 383

48- "اندرون حیدرآباد"

خالدہ ادیب خانم / ہاشمی فرید آبادی مطبوعہ انجمن اشاعت اردو احمدیہ پریس حیدر آباد دکن 1939ء

49- "انوکھا حاجی"
ویول / مرزا حسین احمد بیگ مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدر آباد دکن طبع اول 1923ء ص 212

50- "ایک چینی سیاح کا سفرنامہ"
ہیون ٹی سنگ / نام مترجم ندارد مطبوعہ پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی لاہور طبع اول 1909ء

51- "حالات ایران قدیم" دو جلدیں
میجر جنرل جان میلکم / محبوب عالم مطبوعہ پیسہ اخبار 1905ء صفحات 376

52- "سیاحوں کی کہانیاں" (انتھالوجی)
متعدد نام / مولانا عبدالمجید سالک مطبوعہ لاہور 1926ء

53- "پانچ ہفتے غبارے میں"
جولزورن مطبوعہ موسسہ فرینکلن نیویارک۔ لاہور

54- "دنیا کے گرد اسی دن میں"
جولزورن مطبوعہ موسسہ فرینکلن نیویارک۔ لاہور

55- "زمین کی تہ میں"
جولزورن مطبوعہ موسسہ فرینکلن نیویارک۔ لاہور

56- "سیاحتِ روس"
جواہر لال نہرو / نام مترجم ندارد 1939ء سے قبل شائع ہوا

57- "حالات نجد و الحسا"
میجر ولیم گفر ڈ / محمد انشاء اللہ مطبوعہ وطن اخبار: حمیدیہ پریس لاہور طبع اول 1905ء

58- "عجائباتِ امریکہ"

نام مصنف ندارد / مترجمہ: منشی اللہ دتہ سابق ایڈیٹر اخبار "پنجاب گزٹ" سیالکوٹ، طبع اول 1894ء "تاریخ یوسفی" از یوسف خان کمبل پوش حیدر آبادی کے نول کشوری ایڈیشن "عجائباتِ فرنگ" کے بعد یہ دوسرا اسفرنامہ ہے جس کے نام میں "عجائبات" کا اضافہ کیا گیا۔

منشی اللہ دتہ کی طرز تحریر میں پنجابی پن (پنجاب کی کرخنداری زبان) نمایاں ہے۔ پرواہ' ہوا ہوا تھا اور رو غیرہ وغیرہ الفاظ اس کی مثالیں ہیں۔

نمونۂ عبارت ملاحظہ ہو۔

"ہم ان لوگوں کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ جو گیند کھیلا کرتی ہے جس کے لئے ان کی قوم بڑی مشہور ہے' ملے۔ ان میں سے بعض پیدل تھے۔ بعض سوار تھے اور سواروں کے پیچھے ان کی خوش پوشاک عورتیں تھیں۔ یہ بہت مضبوط اور توانا قوم ہے۔ اور ان کی ٹانگیں اور رانیں خوب موزوں ہیں۔ وہ بھڑکیلے رنگوں اور آراستگیوں کی بڑی مشتاق ہیں۔ چناں چہ جب ان کو جنگلات میں فاصلہ دراز پر دیکھیں تو وہ چمکتی اور خیالی چیزیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک کے سر کے گرد قرمزی رنگ کا رومال بندھا ہوا تھا۔ اور مرغ کی دم کے کالے پروں کی کلغی اس کے سر پر لگی ہوئی تھی اور ایک نے پروں کی تہ ملنے کے سبب اپنی پگڑی میں ایک درخت کے چمکیلے خوشے کو لگایا ہوا تھا۔"

59- "خیابان فارس"

لارڈ جارج نتھینیئل کرزن مترجمہ مولانا ظفر علی خان مطبوعہ مطبع شمسی حیدرآباد دکن طبع اول 1902ء (جلد اول) وائسرائے ہند لارڈ کرزن کے سفرنامے کا ترجمہ ظفر علی خان نے چار جلدوں میں مکمل کیا۔ اس ترجمے کی پہلی جلد 612 صفحات پر مشتمل تھی۔ یہ Persia and the Persian Question کا ترجمہ ہے۔

نمونہ عبارت ملاحظہ ہو۔

"سلمانیہ نہر کریج کے کنارے پر جو کوہستان سے نکلتی ہے اور جس کا مصفی اور پاکیزہ پانی فتح علی شاہ مشکوں میں بھر وا کر ہر روز طہران منگوایا کرتا تھا واقع ہے۔ اور اس میں دو بڑی تصویریں آغا علی شاہ اور اس کے بھتیجے فتح علی شاہ کے درباروں کی عبداللہ خاں کے ہاتھ کی کھچی ہوئی ہیں جو ابتدائے شاہانِ قاچار کے دربار کا مشہور نقاش تھا۔

سفر ایران کے لئے بہترین موسم کے انتخاب کے دو اختیاری پہلو ہو سکتے ہیں' یا تو موسمِ خزاں کا آخری حصہ اور یا فصلِ بہار۔ موسم اول الذکر اکتوبر سے جنوری تک رہتا ہے اور ثانی الذکر مارچ سے شروع اور مئی میں ختم ہوتا ہے۔"

(جلد اول سے اقتباس)

حج نامے

ہندوستان سے متعلق سفر ناموں اور انگریزی سے ترجمہ شدہ سفر ناموں کی تفصیل نقل کرنے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حج ناموں کا ذکر کر لیا جائے تاکہ آگے چل کر خالص سفرنامے پر بات کرنے میں آسانی ہو۔

حج ناموں کی روایت پر نظر ڈالیں تو حضرت سید احمد بریلوی شہید کی سیرت سے متعلق ''سوانح احمدی'' اپنی تاریخ اہمیت کے ساتھ ابھر کر سامنے آئی ہے۔ اس لئے کہ اس کتاب میں 1821ء میں حاصل کی جانے والی حج کی سعادت سے متعلق معلومات درج ہیں۔ لیکن یہ کتاب باقاعدہ حج نامہ نہیں۔ یوں بھی اس روایت میں اولیت کا سہرا شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے سر ہے۔ ان کا حج نامہ بہ عنوان ''جذب القلوب'' 1589ء میں حج کی سعادت حاصل کرنے سے متعلق ہے۔ دوسرا قدیم ترین حج نامہ 1731ء کے سفر حج سے متعلق حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کا ہے۔

اس روایت میں آر۔ ایف برٹن کا ''سفر دار المصطفےٰ'' (دپلگری میج ٹو المدینہ اینڈ مکہ) تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ انگریزی میں یہ کتاب لندن سے 1855ء میں شائع ہوئی اور اس کا اردو ترجمہ اپریل 1910ء میں چھپ کر سامنے آیا جو بڑے سائز کے 256 صفحات پر مشتمل تھا۔ کتاب کے سرورق پر بیل دار حاشیہ میں مندرجہ ذیل عبارت درج ہے۔

''الحمد اللہ العظیم کہ دریں ایام فرصت انجام کتاب نادر البیان مسمےٰ بہ۔

سفر دار المصطفےٰ

کپتان رچرڈ فریڈرک برٹن کی انگریزی کتاب کا سلیس و با محاورہ اردو ترجمہ بادارت مولوی محمد انشاء اللہ ایڈیٹر و مالک اخبار وطن لاہور۔ حمیدیہ سٹیم پریس لاہور میں باہتمام مولوی انشاء اللہ مینجر مطبع طبع شد''۔

واضح رہے کہ اس کتاب کا مصنف رچرڈ برٹن ''الف لیلےٰ'' کا انگریزی ترجمہ کر کے عالمگیر شہرت حاصل کر چکا ہے۔ مولوی انشاء اللہ ''سفر دار المصطفےٰ'' کے ابتدائیہ میں لکھتے ہیں۔

"............جو رتبہ عربی سفر نامہ زمانہ سابق میں لکھنے سے محمد ابن جبیر اندلسی کو حاصل ہے وہی پایہ زمانہ حال میں انگریزی سفر نامہ لکھنے میں کپتان برٹن کو حاصل ہے............واقعات کا حال امانت اور دیانت سے لکھا ہے۔

مگر جس جگہ واقعات میں اپنی رائے کو شامل کر دیا ہے وہاں تعصب کی جھلک دکھادی ہے"۔(ص نمبر ۷)

رچرڈ برٹن مدینہ منورہ پہنچ کر شیخ حامد کے مہمان ہوئے کامل غسل اور مسواک کر کے سفید جامہ ءلطیف پہن کر روضہ ءنبویؐ پر حاضری دیتے ہیں لیکن شراب کی بوتل ساتھ رکھتے ہیں:

"جب تک مدینے میں مقیم رہا اس وقت تک کاگنگ کی ایک بوتل پر قانع رہا۔ اس بوتل کو میں نے ایسا رنگ لیا تھا اور اس میں خوشبو ڈال رکھی تھی کہ وہ دوائی کی بوتل معلوم ہوتی تھی" (ص222)

اس روایت میں دوسرا حج نامہ انگریز نو مسلمہ لیڈی ایولن کبولڈ زینب کا "حج زینب" محسن شبیر نے ترجمہ کیا ہے جو پہلی بار مکتبہ ابراہیمیہ آباد دکن سے 1941ء میں طبع ہوا۔ اسی طرح آسٹروی نو مسلم محمد اسد کا حج نامہ "The Road to Makkah" کا ترجمہ "طوفان سے ساحل تک" مطبوعہ مجلسِ تحقیقات و نشریات اسلام۔ لکھنؤ 1961ء کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

محمد اسد (اصل نام Leopold Weiss) پیدائش 1900ء آسٹریا (پولینڈ) کا شمار دور حاضر کے نمایاں مسلم سکالرز میں ہوتا ہے۔ ان کی دو کتابیں "Islam at the Cross-roads" اور "The Road to Makkah" ازحد مقبول ہوئیں ان کی آخر الذکر کتاب (حج نامہ) کا آخری باب آج کل پنجاب یونیورسٹی کے بی۔ ایس سی کے انگریزی نصاب کا حصہ ہے۔

اردو میں لکھے گئے دیگر اہم حج ناموں کی تفصیل درج ذیل ہے۔

-1	"سفر نامہ حرمین شریفین"	از سید کاظم حسنین شیفتہ	طبع اول	1893ء
-2	"سفر نامہ حرمین الشریفین"	از حکیم محمد محی الدین حسین	طبع اول	1903ء
-3	"سفر نامہ حجاز و مصر"	از نواب احمد حسین خاں	طبع اول	1903ء
-4	"ریاض الحرمین"	از حاجی نور الدین قصوری	طبع اول	1904ء
-5	"سفر حرمین الشریفین"	از خان بہادر محمد عبد الرحیم	طبع اول	1910ء

6- "سفر نامۂ حجاز و مصر و شام" از خواجہ حسن نظامی طبع اول 1911ء
'مصور فطرت' خواجہ حسن نظامی نے ایک مبلغ کی حیثیت سے مصر، فلسطین، شام اور حجاز کا یہ سفر 1911ء میں کیا اور اسی سال یہ سفر نامہ کتابی صورت میں شائع ہو گیا۔ اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن دہلی سے 1923ء میں سامنے آیا'
سفر نامے سے اقتباس ملاحظہ ہو۔

"28 جولائی 1911ء صبح ساڑھے سات بجے بیروت سے روانہ ہوئے اور عصر کے وقت دمشق پہنچے۔ تمام راستہ پہاڑوں کا ہے جو اس قدر سر سبز ہیں کہ بہشت کے ٹکڑے معلوم ہوتے ہیں' ان پہاڑوں کو لبنان کہتے ہیں' یہاں بکثرت نصاریٰ آباد ہیں اور فرانسیسی حکومت کا اثر زیادہ ہے۔

بیروت سے دمشق تک جو پہاڑ ہیں ان کی دل فریبی کا کیا کہنا۔ جب ریل کسی اونچی چوٹی پر چڑھتی تو غاروں اور وادیوں کی سر سبزی' انگوروں کی بیلوں کا لہلہانا' بادلوں کا نیچے گھرا ہوا نظر آنا' سامنے کوسوں سمندر کی سطح ایسے نظارے ہیں کہ جی سیر نہیں ہوتا۔ یہی وہ شامی پہاڑ ہیں جن کے تذکرے توریت' انجیل' قرآن میں جگہ جگہ مذکور ہیں۔ ہندوستان کے ہریالے پہاڑ بھی میں نے دیکھے۔ سبحان اللہ اپنی شان آپ ہیں یہ بھی نمونہ قدرت ہیں مگر شامی پہاڑوں میں غالباً خدا نے اپنے مخفی حسن کا جلوہ بکھیر دیا ہے۔ درخت اور سبز پتے تو درکنار جنگلی کانٹوں تک کی رنگینیاں اور شوخیاں آنکھوں میں چبھی جاتی ہیں۔

آب و ہوا کا یہ عالم کہ اس سر زمین میں ریل کا داخل ہونا تھا کہ دماغ میں طرح طرح کے ولولے اور جذبے پیدا ہونے لگے۔ ایک جگہ ریل ٹھہری۔ بیسیوں عورتیں بچے دوڑے ہوئے آ گئے۔ ہاتھوں میں بڑی بڑی روٹیاں' پنیر' ابلے ہوئے انڈے۔ کسی کے ہاتھ میں اخروٹ کی گری۔ کوئی سیب مش مش اور آلوچہ انجیر سے لبریز ٹوکریاں لئے ہوئے۔ دو پیسہ کا ہلیلہ۔ یا متلیک دیا۔ اس نے میوہ کی ٹوکری قدموں میں خالی کر دی۔ یاالٰہی یہ زمین ہے یا بہشت میوہ اتنا سستا کون کھا سکتا ہے۔ ہمارے یہاں جو سیب دو پیسہ اور چار پیسہ عدد آتا ہے اس کی وہاں دو پیسہ کو ایک دو سیر کی لبریز ٹوکری دستیاب ہوتی ہے اور پھر ذائقہ کی نہ پوچھئے' انجیر رنگ سبز درمیانی سیب کے برابر اور اس قدر شیریں کہ دو مشکل سے کھائے جائیں۔ یہی حال اور میووں کا سمجھئے۔ کاش ترک ان کی تجارت کرتے حفاظت کے ساتھ غیر ملکوں میں بھیجتے اور لاکھوں کروڑوں روپیہ سے خزانہ بھرتے تاہم دوسرے پہلو سے ملک والوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ ملک کی چیز ملک میں رہے۔ ان پہاڑوں میں جگہ جگہ آبادیاں ہیں جن میں عموماً عیسائی آباد ہیں۔ مسلمان بھی ہیں۔ امیر لوگ گرمیوں کے موسم میں یہاں آکر رہتے ہیں۔

شاندار ہوٹل اسٹیشنوں کے قریب بنے ہوئے ہیں۔ ایک اسٹیشن پر گاڑی ٹھہری۔ چند بچے لڑکے لڑکیاں پیسے مانگنے کو آگئے۔ ایک لڑکی بولی محمدؐ کے نام کا صدقہ مجھے کچھ دو۔ اس معصوم کی زبان سے ان اونچے اخضری پہاڑوں میں یہ نام کیسا بھلا لگا۔ میں نے کہا اس نام پر میں کیا قربان کروں۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر بھی یہی گونجنے آیا۔ جو کچھ جیب میں تھا۔ بچی کے آگے رکھ دیا۔ آنکھیں آنسو برساتی تھیں۔ آواز بے قابو تھی' دل سینہ میں پھڑکا جاتا تھا۔ لڑکی یہ سماں دیکھ کر دعائیں دینے اور درود شریف کے اشعار پڑھنے لگی۔ زخموں پر نمک پاشی تھی۔ اسی اثناء میں ایک اور لڑکا آیا اس نے بھی مانگا۔ اور دوسرے بچوں سے واقعہ سن کر اس ظالم نے بھی وہی نام لیا۔ مسافر پر کتنا ظلم تھا۔ مجھ کو یہ فتنے کس قدر ستاتے تھے۔ حاجی عبدالکریم سیٹھ بمبئی سے مانگ کر اس کے بھی کچھ حوالے کیا۔ کیونکہ بے نوا کی جیب خالی تھی۔ یہ دیکھ کر لڑکی بولی یا حاجی واللہ ہذا النصرانی (خدا کی قسم یہ تو عیسائی ہے) آپ نے اس کو کیوں دیا۔ میں نے کہا نادان' عیسائی ہے تو ہوا کرے۔ سنتی نہیں اس نے نام کیسا لیا۔ اس نام کے دربار میں عیسائی' موسائی' مسلمان سب برابر ہیں۔ قربان اس نام کی ٹھنڈک کے۔ صدقے اس نام کی نشتر اندازی کے' نثار اس نام کے نامعلوم زخم آفرینی کے۔

عصر کے وقت دمشق کے اسٹیشن پر پہنچے۔ حاجی عبداللہ ہندی استقبال کو موجود تھے۔ یہ ہندی مسافروں کی رہبری کا پیشہ کرتے ہیں۔ ہوٹل والوں کی تھوڑی سی کش مکش یہاں بھی ہوئی مگر ہم لوکندہ قدس الشریف میں ٹھہرے۔ اس کے مالک سید درویش نوجوان اور ملنسار آدمی ہیں۔ ان کے والد کا ایک قدیمی ہوٹل مدینہ منورہ کے نام سے قائم ہے۔ اب انہوں نے اپنا ذاتی ہوٹل قدس الشریف کے نام سے کھولا ہے۔

دمشق پہنچتے ہی ڈاک کا خیال آیا۔ حاجی عبداللہ ہندی نے بیان کیا۔ حسن نظامی کے نام سے بہت خطوط آئے تھے۔ ڈاکخانہ نے ایک ایرانی تاجر کو جس کا نام حسن نظامی ہے' وہ خطوط دیئے ہیں۔ وہ تاجر مجھ سے کہتا تھا کہ یہ ڈاک کسی ہندی کی ہے میری نہیں ہے' میں نے امانت رکھ چھوڑی ہے اس نام کا کوئی شخص آئے تو مجھ کو خبر کرنا۔

مجھ کو اس خلفشار سے ایک گونا الجھن تو ہوئی اور کئی ہفتہ کے انتظار کے بعد اپنے ملک کی حالت معلوم کرنے کا جو شوق تھا۔ اس کو صدمہ پہنچا لیکن اس لطف نے کہ میرا ہم نام اس شہر میں ہے غم غلط کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ ہندوستان میں میرا ہم نام کوئی نہیں ہے۔ تاریخ فرشتہ میں ایک مورخ کا نام حسن نظامی بچپن میں دیکھ کر میں نے یہ لقب اختیار کیا تھا اور علی حسن کی جگہ حسن نظامی رکھا تھا۔ مگر دمشق میں ہم نام نکل آیا۔ وہ رات خاموشی میں گزری

کھانا دوسرے ہوٹل سے منگا کر کھایا اور سو گئے۔"

("سفر نامہ حجاز و مصر و شام" از خواجہ حسن نظامی)

-57 "سیاحت سلطانی" (سفر نامۂ حجاز) از نواب سلطان جہاں بیگم شاہبانو طبع اول 1911ء
یہ سفر نامۂ حجاز' والئی ریاست بھوپال شاہ بانو کا ہے۔ اس حقیقت کی وضاحت از بس ضروری ہے کہ وسطِ ہند کی مشہور ریاست بھوپال کی مسندِ حکومت پر یکے بعد دیگرے چار خواتین بیٹھ چکی ہیں۔ جن میں نواب سلطان جہاں بیگم شاہ بانو اپنی انتظامی قابلیت' تعلیم نسواں کی حمایت اور مجموعی طور پر تعلیم کے فروغ کے سبب از حد مقبول ہیں۔ ان کی دیگر کتب میں "گوہر اقبال" اور "کتاب معیشت" قابل ذکر ہیں۔

-8	"سفر نامہ حجاز"	از فاطمہ بیگم	طبع اول	1924ء
-9	"سبیل الرشاد"	از قاضی محمد سلیمان منصوری	طبع اول	1924ء
-10	"سفر نامۂ حرمین"	از مولوی رفیع الدین مراد آبادی	طبع اول	
-11	"صراط الحمید"	از پروفیسر الیاس برنی		
-12	"طوفان سے ساحل تک" از محمد اسد (نو مسلم) ترجمہ "روڈ ٹو مکہ" کا ترجمہ		طبع اول	1926ء

-13 "سفر حجاز" از مولانا عبد الماجد دریابادی مطبوعہ 'معارف پریس اعظم گڑھ
یہ سفر مولانا نے 1929ء میں کیا تھا۔ حج نامے سے اقتباس ملاحظہ ہو۔
"طور کی چوٹیاں جس کی تجلیاتِ جمال کی جلوہ گاہ بننے لگیں تو پاکوں کے پاک اور دلیروں کے دلیر' موسیٰ کلیم تک تاب نہ لا سکے اور اللہ کی کتاب گواہ ہے کہ کچھ دیر کے لئے ہوش و حواس رخصت ہو گئے۔ معراج کی شب' جب کسی کا جمال بے نقاب ہونے لگا تو روایات میں آتا ہے کہ اس وقت وہ عبد کامل جو فرشتوں سے بھی بڑھ کر مضبوط دل اور قوی ارادہ کا پیدا کیا گیا تھا' اپنی تنہائی کو محسوس کرنے لگا اور ضرورت ہوئی کہ رفیق غار رضی اللہ عنہ' کا مثل سامنے لا کر آب و گل کے بنے ہوئے پیکرِ نورانی کی تسلی کا سامان کیا جائے۔"

-14 "سفر سعادت" از منشی امیر احمد علوی مطبوعہ : ناظر پریس لکھنؤ 1932ء
حج نامہ سے اقتباس ملاحظہ ہو۔
"جدہ میں خطبہ و سکہ سلطان ابن سعود کا ہے۔ لیکن حکومت در حقیقت برٹش کونسل کرتا ہے۔ ابنِ مسعود کی لونڈی غلام بھاگ کر انگریزی سفارت خانے میں پناہ لیتے ہیں اور کانسل جنرل ان کو جہازوں پر سوار کرا کے بے تکلف ملک سے باہر نکال دیتا ہے۔ لیکن ملک

الحجاز نہیں مار سکتا۔ کانسل کی اجازت کے بغیر کوئی قافلہ جدہ سے مکہ یا مدینہ نہیں جا سکتا مگر بادشاہ کو دخل دینے کا اختیار نہیں 'بلکہ مکہ معظمہ اللہ کی حفاظت میں ہے مگر انگریزی کانسل جس دن چاہے چند گھنٹوں میں یہاں قبضہ کر سکتا ہے۔"

15- "دیارِ عرب میں" از مولانا مسعود عالم ندوی

16- "سفر نامۂ بلادِ اسلامیہ" از نواب بہادر یار جنگ

17- "بلادِ اسلامیہ کی سیر" از نواب بہادر یار جنگ

18- "مشرقِ اوسط میں کیا دیکھا" از مولانا ابو الحسن علی ندوی

اقتباس ملاحظہ ہو۔

"حج کے بعد میں اپنے شوق کے پروں پر اڑتا ہوا مدینہ منورہ کی طرف چلا۔ محبت اور وفا کی کشش مجھے مدینہ منورہ کی طرف بے ساختہ کھینچ رہی تھی۔ راستہ کی زحمتوں کو میں رحمت سمجھ رہا تھا اور میری نگاہ کے سامنے اس پہلے مسافر کا نقشہ گھوم رہا تھا جس کا ناقہ اسی راستہ سے گیا تھا اور اس نے راستہ کو اپنی برکتوں سے بھر دیا تھا۔"

19- "زیارت الحرمین" از مولوی عاشق الٰہی میرٹھی

20- "السکینہ باخبار المدینہ" از صبغت اللہ

21- "سفر نامۂ رحیمی" از محمد امانت اللہ

22- "سفر نامۂ حجاز" از مولوی ظفر احمد تھانوی مطبوعہ 1933ء

23- "سفر نامۂ بلادِ اسلامیہ" از مولوی محمد عبد العزیز مطبوعہ 1935ء

24- "حجِ صادق" از نواب آف بہاولپور مطبوعہ 1935ء

25- "کلیدِ جنت" از عبد الحمید خان مطبوعہ 1936ء

26- "سفر نامۂ حجاز" از عبد الحمید بوبیرے

27- "مکے مدینے کا سفر نامہ" از خسرو شاہ نظامی

28- "سفر نامۂ صارم" از عبد الصمد صارم مطبوعہ 1938ء

29- "رہنمائے حج" از حکیم امیر الدین مطبوعہ 1952ء

30- "پیر حرم وزائر جرم" از شیخ عبد الرحیم ایڈوکیٹ مطبوعہ 1954ء

31- "کاروانِ حجاز" از مولانا ماہر القادری

اقتباس ملاحظہ ہو۔

"جب ہم مسجد نبویؐ میں حاضر ہوئے تو ظہر کی نماز تیار تھی۔ سنتوں کے بعد جماعت

سے نماز ادا کی۔ کہاں مسجد نبویؐ اور سجدہ گاہِ مصطفویؐ اور کہاں میں! پیشانی کی اس سے بڑھ کر معراج کیا ہو گی؟ نماز کے بعد اب روضہ اقدس کی طرف چلے۔ حاضری کی بے اندازہ مسرت کے ساتھ اپنی تہی دامنی اور بے مائیگی کا احساس بھی ہے"

32- شب جائے کہ من بودم از شورش کاشمیری

اپنے عہد کے لاثانی مقرر اور صحافی شاعر کا یہ حج نامہ کئی اعتبار سے اہم ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو۔

"دل اور جہاز دونوں اڑتے چلے جا رہے تھے۔ بحرین کے ہوائی اڈے پر جہاز 45 منٹ ٹھہرا۔ یہاں سے عرب شروع ہو جاتے ہیں لیکن انگریزوں کے تصرفات نے بحرین کو تاراج کر دیا ہے۔ ائرپورٹ پر شراب کی ایک کھلی دکان ہے۔ ادھیڑ عمر کی ایک ولندیزی عورت اس کی مہتمم ہے۔ وہ ہر نوعی شراب کی بوتلوں کے پیش منظر میں کھڑی مسافروں کو گھورتی اور پکارتی ہے۔ فربہ اندام جیسے سفید تھیلے میں گودا ابھرا ہو' چہرے پر پیلے رنگ کی بندیاں ہیں جیسے کسی سفید کاغذ پر تجریدی آرٹ کی مشق میں سیاہی کے قطرے ٹپک گئے ہیں۔ یہ عورت غالباً ان بوتلوں کے ساتھ ہی درآمد کی گئی ہے۔ بحرین عربوں کے حاشیہ میں یورپی تہذیب کا دمِ واپسیں ہے۔ استعمار نے اس کا خون نچوڑ لیا اور اس کی جگہ شراب دے گیا ہے۔

پاکستان کے ساحل سے حجاز کے ساحل تک عدن' ابو ظہبی' کویت' بحرین' مسقط وغیرہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں نفس کی حکمرانی ہے۔ ان کے والی شکروں سے شکار کرتے ہیں۔ ہر نوعی شکار' پرندوں سے لے کر عورتوں تک کا شکار۔ ان کے امراء مسلمان کہلانے کے باوجود قبل از اسلام کے ایامِ جہالت میں زندگی گزار رہے ہیں اور اپنے حقیقی شرف کو بھول چکے ہیں۔ ان کے لئے تیل کے چشموں نے دولت کے پٹ کھول دیئے ہیں۔ ان کی زمینیں دولت اگلتی اور وہ نفس عیش مانگتے ہیں۔ ان کے حرم حسن و جوانی کے مذبح ہیں۔ یہ زندگی گزارنے کے لئے نہیں' زندگی نچوڑنے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔

میں نے بحرین کے ہوائی اڈے پر کسی عرب کے چہرے کو شگفتہ نہیں پایا۔ وہ رونق جو غیرت پیدا کرتی ہے ان کے چہروں سے اڑ چکی ہے۔ عرب دنیا میں امیروں اور غریبوں کے درمیان واضح طور پر حدِ فاصل کھنچی ہوئی ہے۔ امراء زندگی گزارتے ہیں اور غرباء کو زندگی بسر کرتی ہے۔ نئی نسلیں ان سے لبا کرتی ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا عرب کا نیا خون کب تک اسلام کا ساتھ دے گا اور اسلام کب تک انہیں ساتھ لے کر چلے گا۔ وہ قیامت ضرور آنی چاہئے اور آکر رہے گی جس کی خبر قرآن نے دی ہے۔ یہ تمام اس کی نشانیاں ہیں جو بحرین سے

جدہ تک پھیلی ہوئی ہیں۔

بحرین سے اڑتے وقت تھوڑی دیر تک میں غیر متوازن خیالوں کی کشمکش میں الجھا رہا' افکار کے طلوع و غروب کا ایک عجیب سلسلہ تھا جس نے میرے دل و دماغ کو ہلا رکھا تھا۔ لیکن جلد ہی میری سوچ پر میرا عشق غالب آ گیا۔

ائر ہوسٹس نے کہا تھوڑی دیر میں ہم جدہ ایئر پورٹ پر اترنے والے ہیں۔ امید ہے آپ کا سفر خوشگوار گزرا ہوگا۔ میں نے جھروکے سے باہر جھانکا تو پہاڑی سلسلے کالکوں کی طرح پھیلے ہوئے تھے اور پھر تھوڑی سی دیر میں ہم جدہ ایئر پورٹ پر اتر گئے .... لبیک اللھم لبیک پاسپورٹ وغیرہ کی چیکنگ تو فوراً ہو گئی تکلیف نہ تاخیر لیکن کسٹم والوں نے دو گھنٹے تک روکے رکھا۔ ان کے ہاں سب سے خطرناک چیز کتابیں' اخبار اور رسالے ہیں۔ اصل دقت زبان کی ہے۔ کلام اللہ کا اردو ترجمہ بھی روک دیا جاتا ہے لیکن لبنان کے عربی جرائد و رسائل بالخصوص جن میں حوا کے بیٹوں اور زلیخا کی ہم نشینوں کا نخرہ نمایاں ہوتا ہے' ہر قدغن سے آزاد ہیں' وہ روزانہ آتے اور روزانہ بکتے ہیں۔ حرمین شریفین کے آس پاس کی دکانوں میں بکتے ہیں اور کی خریداری عورتوں میں بکثرت ہوتی ہے۔ ان برہنہ و نیم برہنہ رسالوں پر کوئی پابندی نہیں' پابندی ہے اس لٹریچر پر ہے جس پر یقین کیا شبہ ہو کہ اس میں مزاج شاہی پر چوٹ کی گئی ہے۔

نازک مزاج شاہاں تابِ سخن ندارد

شراب' چرس اور کتاب تینوں پر کسٹم کی نگاہیں رہتی ہیں۔ لطف یہ کہ کتاب یا رسالہ کسٹم سنسر نہیں کرتا۔ وہ محکمہ تعلیم کے پاس جاتا ہے اور محکمہ تعلیم کے ارکان کی مرضی پر ہے کہ وہ مہینوں اور ہفتوں میں سنسر کریں۔ چاہے روک لیں چاہے پاس کر دیں"

2- "ایک عام کیفے میں جو سڑک کے کنارے واقع تھا قہوہ پیا' کچھ اس میں سرور تھا کچھ عشق نے سرور پیدا کیا دو آتشہ ہو گیا۔ یہ تھا آقائے گیتی پناہ کے ہاں پہلا مشروب۔

بہ عذر خواہی رنداں بادہ نوش آمد

میں ظہر کے وقت جدہ پہنچا اور عصر کی نماز بیت اللہ میں پڑھنا چاہتا تھا۔ دل مچلا ہوا تھا کہ جلد سے جلد بیت اللہ پہنچوں' ہم چاروں فوراً روانہ ہو گئے۔ موٹر فراٹے بھرنے لگی۔ مکہ مکرمہ تک دہری سڑک ہے' ایک سے موٹریں آتی اور دوسری سے جاتی ہیں۔ وسط میں دو بازوؤں کی طرح بجلی کی ٹیوبیں پھیلی ہوئی ہیں آزادو بازو پہاڑوں کا زاویے بنا ہوا سلسلہ ہے۔ اس کے بیچوں بیچ سڑک اسی طرح نکلتی ہے جس طرح کسی دوشیزہ کی مانگ نکلی ہو۔ جدہ کی بھیڑ چھٹ جاتی اور روشینوں کے آویزے ایک حد پر ختم ہو جاتے ہیں پھر پہاڑ سڑک کا ہالہ

کرتے یا سڑک پہاڑوں میں بہتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ اتنی صاف سڑک کہ ہر چیز ستھری نظر آتی ہے۔ محبوب کے راستے ہمیشہ دلفریب ہوتے ہیں۔ آخر تک پہاڑ ہی پہاڑ ہیں' مرصع و مسجع عبارتوں کی طرح صدیوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے۔ گو اب منہ میں گھنگھنیاں ڈالے کھڑے ہیں لیکن کبھی گویا ہوں گے۔ آدم علیہ السلام جنت سے نکلے تو سراندیپ سے ہوتے ہواتے عرب پہنچے تھے۔ حضرت حوا کی قبر جدہ ہی میں بیان کی جاتی ہے۔ اللہ کے نبیوں اور رسولوں میں سے جانے کون کون یہاں سے گزرا ہو گا؟ یہ پہاڑ تب سے اب تک کھڑے ہیں' چپ چاپ' جیسے یہ کہہ رہے ہوں ؎

گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست

("شب جائے کہ من بودم" از شورش کاشمیری)

33- "حج ذوقی"	از سید محمد ذوقی شاہ	مطبوعہ 1951ء
34- "دیار عرب میں چند روز"	از مسعود عالم ندوی	
35- "سفر نامہ حجاز"	از نشاط النساء بیگم (بیگم حسرت موہانی)	
36- "محاذ حجاز"	از علامہ شفق عماد پوری	
37- "مشعل راہ"	از محمد اقبال الثقلین	
38- "چند دن حجاز میں"	از حاجی محمد زبیر	مطبوعہ 1956ء
39- "سفر نامہ حج زیارت"	از عبد الصمد صارم	مطبوعہ 1957ء
40- "سیاست حج"	از ملک دین محمد	
41- "دیارِ حبیب کی باتیں"	از فضل الدین ایڈووکیٹ	
42- "سفر حجاز"	از عبد الکریم ثمر	مطبوعہ 1959ء
43- "پاکستان سے دیارِ حبیب تک"	از نسیم حجازی	مطبوعہ 1959ء
44- "آئینۂ حجاز"	از راجہ محمد شریف (یہ از حد ضخیم حجاز نامہ ہے)	
45- "سفر نامہ ارض القرآن"	از محمد عاصم	
46- "مشاہدات بلاد اسلامیہ"	از محمودہ عثمان حیدر	
47- "جمالِ حرمین"	از حافظ لدھیانوی	
48- "جدے سے برمنگھم تک"	از مولانا طاہر القادری	
49- "داستانِ حرمین"	از محمد منیر قریشی	

50- "زلوالسلیم" از حاجی محمد موسیٰ خان شیروانی

51- "راہ وفا' سفرنامہ بلاد اسلامیہ" از مولانا حفیظ الرحمٰن وفا بائیوی طبع اول 1938ء

52- "زیارت الشام و القدس" از مولانا عاشق الٰہی میرٹھی

53- "عراق و ایران' سفرنامہ مقامات مقدسہ" از نواب میر اسد علی خان

54- "حدیثِ دل" از وحیدہ نسیم 'طبع اول' 1980ء

دورِ جدید کے حجاز ناموں میں وحیدہ نسیم کا "حدیثِ دل" در حقیقت ان کے عمرے کا احوال ہے اور آغاز وحیدہ نسیم کی ایک نعت سے ہوتا ہے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو۔

اپنی حدیث دل کی تفسیر کیا لکھوں
اک خواب تھا وہ' خواب کی تعبیر کیا لکھوں

یہی نہیں' انہوں نے 'حدیثِ دل' میں دیگر مقامات پر بھی شعری اظہار کا سہارا لیا ہے۔ ان کے درج ذیل اشعار دامن دل کو کھینچتے ہیں۔

حاضر ہیں دست بستہ امت کے دل شکستہ
لائے ہیں قلبِ خستہ کھویا ہوا ہے رستہ
لکھوں سلام تم پر

یوں خواتین کے ہی کیا' جملہ حجاز ناموں میں 'حدیث دل' کی انفرادیت اس کا اسلوب ہے۔ شعری لحن نے اس میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔

"اے حطیم کے گرم پتھرو! تم بڑے خوش نصیب ہو کہ تم کو بیت العتیق کا قرب نصیب ہے۔ تم گواہ رہنا کہ پاکستان کی ایک ناچیز' کم مایہ' بے بضاعت' تہی دست خاتون' جس کے پاس نہ کوئی بڑا عہدہ تھا' نہ رتبہ تھا' یہاں سر بسجود ہو کر دعا کی تھی۔"

("حدیثِ دل" از وحیدہ نسیم)

رواں دواں نثر میں محاورات کا بر محل استعمال خوب سجتا ہے۔ وحیدہ نسیم کے ہاں یہ جادو سر چڑھ کر بولا ہے۔

"میں اپنی مخصوص تربیت اور تعلیم کی بنا پر خون کا سا گھونٹ پی کر رہ گئی۔"

(صفحہ 122)

"توبہ کیجئے کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی" دوسری نے جواب دیا۔"
(صفحہ 225)

البتہ بعض مقامات پر انگریزی الفاظ اور اصطلاحات کا استعمال کھلتا ہے۔ جیسے سرچ لائیٹ' بلیک مارکیٹ' اور جنریشن گیپ' جیسے الفاظ واصطلاحات۔ تاہم آزادی فکر' وسعت مطالعہ' اچھا شعری ذوق اور شگفتگی بیان وحیدہ نسیم کی تحریر کی اضافی خوبیاں شمار ہوں گی۔

دو ایک امثال ملاحظہ ہوں۔

"مرید اور شاگرد سب ہی حیران تھے کہ اسلام کا چھٹار کن کون سا ہے۔ آخر کار بزرگ نے فرمایا کہ چھٹارکن 'روٹی' ہے" (صفحہ 110)

"میں نے قیام پاکستان سے لے کر آج تک دو مولویوں کو ایک بات پر متفق نہیں دیکھا۔ یعنی یہ کہ اگر ان سب کا مسلک ایک ہوتا تو اسلام کے نام پر ستر ہزار جماعتیں نہ بنتیں۔ (صفحہ 29)

'حدیثِ دل' میں موقع کی مناسبت سے بر محل اشعار کا استعمال معنویت میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔

55- "سیر وسفر" از اختر ریاض شیخ' طبع اول 1981ء

اختر ریاض شیخ کا حجاز نامہ "سیر وسفر" بیک وقت حجاز نامہ بھی ہے اور سفر نامہ بھی۔ اس لئے کہ "سیر وسفر" میں افریقہ' ایشیاء اور یورپ کے متعدد ممالک کی سیر کا احوال ملتا ہے۔ مصنفہ چین سے واپسی پر فریضہء حج کی ادائیگی کے لئے حجاز مقدس روانہ ہو جاتی ہیں اور یوں ڈائری کے انداز میں مختلف ممالک کی سیر آخری حصے میں حجاز نامے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ سیر وسفر کا باعث صنعتی نمائشوں کے وہ دعوت نامے بنتے ہیں جو اختر (مصنفہ) کے خاوند ریاض شیخ کو موصول ہوتے رہے۔ واضح رہے کہ ریاض شیخ لاہور میں ایک ربڑ فیکٹری کے مالک ہیں۔

اس سفر نامے کے دیباچہ نگار محمد سرور رقم طراز ہیں:

"ڈائری میں کہیں الجھاؤ نہیں' اور نہ خواہ مخواہ باتیں بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ڈائری نویس نے جو کچھ دیکھا' قلم بند کر دیا۔ اور جو تاثرات ہوئے بلا کمی بیشی کے لکھ دیئے۔ بیگم شیخ ریاض نے سادہ زبان اور سادہ اسلوب میں اپنے سفروں کی مختصر روداد بیان کر دی ہے اور اس دوران میں جو تجربات ہوئے' وہ کسی تکلف کے بغیر سمیٹ لئے۔"

دیباچہ نگار کی اس وضاحت کے ساتھ 'سیر وسفر' سے محض ایک مثال دیکھتے چلئے۔

"دیکھنے میں آیا کہ ملیشیا کی عورتیں بہت صلح کل ہیں............افریقی ملکوں کی عورتیں تو ہتھنیاں لگتی ہیں۔" (صفحہ 39)

"سیر و سفر" برائے نام حجاز نامہ ہے اس لئے کہ محض صفحہ 32 تا 41 پر حج اور زیارات سے متعلق معلومات ملتی ہیں بقیہ کتاب مختلف ممالک کی سیر سے متعلق ڈائری ہے۔

-56 "لاہور سے دیارِ حبیب تک" از سیدہ حمیدہ فاطمہ، طبع اول 1982

سیدہ حمیدہ فاطمہ کا حجاز نامہ "لاہور سے دیارِ حبیب تک" حد درجہ مختصر تحریر ہے لیکن ناپ تول میں پوری۔ انتہائی پر مغز اور نک سک سے درست۔ سیدہ حمیدہ فاطمہ نے اپنے بیان سے متعلق دس عنوانات قائم کئے اور انہیں تک محدود رہیں۔ عنوانات کی جدت اور تنوع ملاحظہ ہو۔

پہلا وہ گھر، آرزو بر آئی، سنہرے سفر کا آغاز، حجر اسود کو بوسہ، ہاجرہ کا اضطراب یاد آگیا، اے اللہ میں حاضر ہوں۔

سفر نامہ نگار نے مواقع کی مناسبت سے اہم نعت گو شعراء خصوصاً محسن کاکوروی، محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خاں اور ڈاکٹر محمد اقبال کے کلام سے انتخاب کرتے ہوئے اچھے ذوق شعری کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

سیدہ حمیدہ فاطمہ کا نقطہء نظر کسی حد تک اصلاح پسندانہ ہے۔ مثال ملاحظہ ہو:

"اگر تم بیویوں کے شوہر ہو، تو خدیجہ اور عائشہ کے مقدس شوہر کی حیات پاک کا مطالعہ کرو۔ اگر اولاد والے ہو تو فاطمہ کے باپ اور حسن و حسین کے پاک نانا کا حال پوچھو۔ اگر تم دولت مند ہو تو مکہ کے تاجر اور بحرین کے خزینہ دار کی تقلید کرو۔ غرض تم جو کچھ بھی ہو اور کسی حال میں بھی ہو، تمہاری زندگی کے لئے نمونہ، تمہاری سیرت کی درستی و اصلاح کے لئے سامان، تمہارے ظلمت خانہ کے ہدایت کا چراغ، راہنمائی کا نور، محمدِ عربی کی جامعیت کبریٰ کے خزانہ میں ہمہ وقت اور ہمہ دم مل سکتا ہے" (صفحہ 91)

اس حجاز نامے کی ایک خوبی یہ ہے کہ عازم حج ہونے والے خواتین و حضرات کو اس سے ارکانِ حج، نیز حج سے متعلق اصطلاحات اور تفصیلات کا بڑا ذخیرہ دیکھنے کو ملتا ہے۔

محض ایک مثال ملاحظہ ہو:

"طواف سے قبل احرام کی چادر کو دائیں بغل کے نیچے اس طرح نکال لیتے ہیں کہ دایاں مونڈھا کھلا رہتا ہے۔ پھر دوسرے سرے کو بائیں کندھے پر ڈال لیتے ہیں اور اس عمل کو 'اضطباع' کہا جاتا ہے۔ یہ عمل صرف مردوں کے لئے ہے، عورتوں کے لئے نہیں۔ طواف

کعبہ میں ایک پھیرے یا چکر کو 'شوط' کہتے ہیں۔ ہر 'شوط' کے بعد دوسرا 'شوط' شروع ہوتا ہے۔" (صفحہ 30)

ایسا نہیں کہ یہ حجاز نامہ محض "حج راہنما" قسم کی تحریر ہے۔ مقاماتِ مقدسہ کی زیارت سے متعلق بیان حد درجہ پرلطف اور عمدہ مشاہدے کی مثال ہے۔ اس تحریر کی غرض وغایت بیان کرتے ہوئے مصنفہ رقم طراز ہیں :

"میں نے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے گوشے گوشے کو اپنی عقیدتوں کا مرکز بنایا اور جس سوزو گداز اور ذوق و شوق میں میرے شب و روز بسر ہوئے، میں نے اسی جذبے کے ساتھ یہ کتاب لکھنا شروع کی۔" (صفحہ 6)

57- "باولی بھکارن" از بشریٰ رحمٰن، طبع اول 1982ء

خواتین کے حجاز ناموں میں بشریٰ رحمٰن کے 'باولی بھکارن' (اللہ میاں جی) کو خاص طور پر یاد رکھا جائے گا۔ اس حجاز نامے میں جس نوع کی خود رفتگی دیکھنے کو ملتی ہے اس کی مثال عام نہیں۔ بلکہ اکثر مقامات تو ایسے ہیں کہ صاحب طرز فسانہ طراز ممتاز مفتی کا تحریر کردہ حجاز نامہ 'لبیک' (طبع اول 1975ء) یاد آجاتا ہے۔ جس میں از خود رفتہ ممتاز مفتی' خانہ کعبہ کو 'کالا کوٹھا' تک لکھ جاتے ہیں۔

بشریٰ رحمٰن نثر میں شاعری کرتی ہیں۔ اور یہی خوبی 'باولی بھکارن' میں سر چڑھ کر بولی ہے۔ روایتی طرز کے حجاز ناموں میں یہ کتاب سب سے الگ دکھائی دیتی ہے۔

58- "زہے نصیب" از زبیدہ حئی، طبع اول 1983ء

شاعرہ زبیدہ حئی کا حجاز نامہ "زہے نصیب" درحقیقت ان کے عمرے کا احوال ہے۔ اس حجاز نامے کا آغاز زبیدہ حئی کے ایک قطعہ سے ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

گریزاں کشتی و ساحل سے ہر طوفان ہو جائے
کٹھن راہوں پہ منزل کا سفر آسان ہو جائے
شعاعِ نور سے تاریکیاں دنیا کی روشن ہوں
درِ حق پہ اگر سجدہ گزار انسان ہو جائے

یہ تو ہوئی قابلِ رشک عقیدت اور خود رفتگی کی بات، لیکن اس حجاز نامے میں جو ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہیں اور جس نوع کی عمدہ نثر دیکھنے کو ملتی ہے، اس کی مثال عام نہیں۔ چند عنوانات ملاحظہ ہوں :

اجنبی لڑکی، حسن باطن، خدائی میزبان، بھول، سیاہ لکیریں اور الجھاؤ۔

اب ملاحظہ ہو عمدہ نثر کا ایک نمونہ۔

"ایک صبح' میں فراک جانگیہ پہنے 'چھرے والی بندوق ہاتھ میں تھامے 'نگاہیں بھولی بھالی چڑیوں' فاختاؤں اور شریر کوؤں کی تلاش میں کسی ماہر کھوجی کی طرح درختوں پر مرکوز' چلی جارہی تھی کہ یکایک میرا دایاں پاؤں کسی چیز سے ٹکرا گیا۔ فوراً جھک کر دیکھا تو وہ بھڑوں سے بھرا ہوا 'بڑا سا چھتہ تھا جو تازہ تازہ درخت سے گرا تھا۔ پلک جھپکتے میں تمام بھڑیں نقل مکانی کر کے میری ٹانگوں پر آباد ہو گئیں اور پوزیشن سنبھالتے ہی فائر کھول دیا۔ میں پوری طاقت سے چیخنے چلانے لگی۔ میں چلتی رہی' بالکل اس طرح' جیسے سلامی کے چبوترے کے سامنے اکڑا ہوا سپاہی رک رک کر چلتا ہے" (صفحہ 173)

زبیدہ حیٔ کے بیان کی دیگر خوبیوں میں وسعتِ مطالعہ 'اشاروں کنایوں میں گہری بات کر جانا' ضرب الامثال کا چناؤ اور تاریخی واقعات کو حقیقت حال کے ساتھ ملا کر دیکھنے کا عمل حد درجہ متاثر کن ہے۔ زبیدہ حیٔ کا مشاہدہ نہ صرف حیران کرتا ہے بلکہ شگفتگی بیان کے ساتھ مل کر ایک ایسی فضابندی کرتا ہے جو خال خال نثر نگاروں کو نصیب ہوئی ہے۔ حسنِ باطن کی ایک جھلک دیکھئے :

"آنکھوں کو بھلے لگتے نقوش' سرخ و سفید گولڈن سیب جیسی رنگت' جس پر غازے کی تہہ نہیں جمی' نہ ہی انگلیوں پر نیل پالش ہے' ملائم بے داغ ریشمی جلد اور گلاب کی پتیوں جیسے لب اسٹک سے بے نیاز لب.......... یہاں غزالی آنکھوں پر حیادار پلکیں جھالر کیے رہتی ہیں اور خواتین کسی بیوٹی پارلر کی محتاج نہیں۔" (صفحہ 142)

اب "اجنبی لڑکی" کا احوال ملاحظہ ہو :۔

"اپنی جگہ سنبھال کر ارد گرد کا جائزہ لینا انسانی فطرت کا تقاضا ہے اور اسی تقاضے کو پورا کرتے ہوئے میں نے سرسری نگاہ مسافروں پر ڈالی۔ جس طرح تتلی چمن میں اپنے لئے گل خوش رنگ پسند کرتی ہے' میری طائرانہ نگاہ بائیں ہاتھ بیٹھی ہوئی نوجوان لڑکی پر رک گئی.......... سفید دوپٹہ' پھول دار لباس' سڈول بدن' گوری رنگت' موٹی آنکھیں' میٹھا پن' دھیما لہجہ جو مجھے پسند ہے۔"

ان نثری خوبیوں اور فنی محاسن کے ساتھ ساتھ "زہے نصیب" میں عمرہ سے متعلق شرعی آداب اور معلومات کا ایک ایسا ذخیرہ موجود ہے جو عازمین عمرہ و حج کے لئے راہنمائی کر سکتا ہے۔

-57 "ارض القرآن" از مولانا مودودی

58- "راہ عقیدت" از مولانا محمد شفیع اوکاڑوی
60- "دیار حبیب میں چند روز" از ڈاکٹر عبادت بریلوی
61- "قافلے دل کے چلے" از الطاف حسین قریشی، مطبوعہ "اردو ڈائجسٹ" لاہور
62- "عرض تمنا" از غلام الثقلین نقوی
63- "مسافر حرم" از کرنل غلام سرور
64- "اللہ کا مہمان" از آغا امیر حسین، طبع اول 1997ء

ایڈیٹر "سپوتنک" لاہور آغا امیر حسین کا یہ حجاز نامہ پہلی بار جون 97ء کے سپوتنک میں اور پھر روزنامہ "جنگ" سنڈے ایڈیشن 1997ء میں سامنے آیا۔ سیدہ حمیدہ فاطمہ کے حجاز نامے "لاہور سے دیارِ حبیب تک" کی طرح یہ بھی حد درجہ مختصر تحریر ہے لیکن ناپ تول میں پوری۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

"6 اپریل کی صبح تہجد کے وقت حرم پہنچے، تیسری منزل کی چھت پر ٹھنڈی ہوا میں خانہ کعبہ اور حجر اسود کے سامنے نماز کا بہت لطف آیا۔ اگرچہ ٹھنڈی ہوا نے تھوڑی دیر بعد نزلہ اور کھانسی کی شدت میں اضافہ کر دیا لیکن وہاں سے ہلنے کو جی نہیں چاہا۔ فجر کی نماز ادا کر کے ہی اٹھے۔ حلوا پوری کا ناشتہ کیا اور واپس آکر سو گئے دو گھنٹے آرام کے بعد مجلس کے لئے فلور نمبر 5 پر چلے گئے آج کل مناسک حج پر سیر حاصل گفتگو ہو رہی ہے۔ عرفات، مسجد الحرام اور منیٰ میں کس وقت کیا کرنا ہوگا احرام مکہ سے بندھے گا وغیرہ وغیرہ، اب وہ مرحلہ قریب ہے جسے "حج تمتع" کہتے ہیں اور جس کے لئے ساری دنیا سے مسلمان "لبیک" کہتے ہوئے مکہ شہر میں جمع ہو رہے ہیں۔ بازاروں میں کھوے سے کھوا چھلنے کا منظر ہے۔

7 اپریل کی صبح کوشش کے باوجود حرم نہیں جا سکے۔ طبیعت خراب رہی۔ نو بجے تک آرام کیا آفاقہ محسوس ہوا نہا دھو کر دس بجے مجلس کے لئے روانہ ہوئے وہاں مجلس کی جائے عرفات، مزدلفہ و منیٰ میں ٹھہرنے کھانے اور مشترکہ عبادت، مجالس وغیرہ کے مسائل درپیش اخراجات کی مد میں چندہ جمع ہو رہا تھا چنانچہ مبلغ ایک سو ریال چندہ جمع کروا کے ہم بھی "ثواب" میں شامل ہو گئے۔ اب حرم کے تہہ خانے بھی کھول دیئے گئے ہیں صفا سے مروہ تک حصہ بند ہے باقی وسیع حصہ انگریزی حرف (یو) کی طرح ہے جس میں ہزاروں افراد نماز ادا کر سکتے ہیں میں نے پورا تہہ خانہ گھوم کر دیکھا اور مغرب کی نماز باجماعت بھی وہیں ادا کی۔ حطیم کے سامنے پہلے بھی نمازیں ادا کر چکے ہیں ہجوم میں بیگم کو تلاش کرنا مشکل ہو گیا چنانچہ عشاء کی نماز ختم ہونے اور ہجوم کے چھٹنے کا انتظار کرنے لگا بیگم کے ساتھ نو بجے باہر

نکلنا ممکن ہوا بازار میں ریسٹورنٹ سے کھانا کھایا اور واپس کمرے میں آگئے اب مکہ میں قافلے دھڑا دھڑ چلے آرہے ہیں آج ذوالحج کا چاند ہونے کا اعلان ہونا تھا لیکن نہیں کیا گیا۔

لیجئے آٹھ اپریل کو پروگرام اور اندازے کے مطابق چاند ہو گیا آج ذوالحجہ کی پہلی تاریخ ہے۔ شاہ فہد اور یاسر عرفات نے غسل کعبہ کے عمل میں شرکت فرمائی۔ خانہ خدا میں جھاڑو دی اور یوں اپنے خادم ہونے کا عملی ثبوت دیا کہ یہ خانہ خدا یعنی کعبہ شریف اور عتیق صرف اور صرف اللہ کا گھر ہے اس کا کوئی اور مالک ہو ہی نہیں سکتا۔ کہتے ہیں کہ جب طوفان نوح آیا تھا اور ساری دنیا غرق ہو گئی تھی تو صرف خانہ خدا ہی محفوظ رہا تھا اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ گھر چوتھے آسمان پر اٹھا لیا تھا اور اب وہاں اللہ کی دوسری مخلوق ہر وقت اس کے طواف میں مصروف رہتی ہے ادھر زمین پر موجودہ کعبہ حضرت ابراہیمؑ اور نبی کریمؐ کی یاد دلاتا ہے۔

نو اپریل کی صبح عجیب کشمکش سے شروع ہوئی رات سونے سے پہلے پروگرام بنایا تھا کہ تین بجے تک حرم پہنچیں گے۔ اڑھائی بجے آنکھ کھل گئی لیکن یہ سوچ کر کہ اگر ابھی بیگم کو جگایا تو طبیعت مزید نہ خراب ہو جائے پھر سو گیا چار بجے سے پہلے پھر آنکھ کھل گئی سوچا حرم کا پروگرام بنایا تو تہجد کا وقت گزر جائے گا چنانچہ وضو کیا اور تہجد کی نماز پڑھنے لگا بیگم بھی جاگ گئیں انہیں نے بھی تہجد اور فجر کی نماز کمرہ ہی میں پڑھ لی۔ آج میں نے فیصلہ کیا کہ تمام فرض نمازوں کے ساتھ ایک ایک قضا عمری بھی پڑھنا شروع کر دیں گے۔ اللہ غفور الرحیم ہے نمازیں پڑھ کر سو گئے۔ کھانے سے فارغ ہو کر سیدھے حرم پہنچے اور طواف کے لئے ہجوم میں گھستے چلے گئے اللہ تعالیٰ نے کامیابی دی اور دباؤ کے باوجود طواف مکمل ہو گیا۔ نماز عشاء کے بعد دعائے کمیل سے فارغ ہو کر (یہ دعا ہر جمعرات کی رات نو بجے ہو رہی ہے) حرم پہنچے۔ یہ سوچ کر کہ بعد میں رش بڑھ جائے گا طواف کے لئے حلقہ میں گھستے چلے گئے۔ آج اندازہ ہوا کہ حلقہ طواف کتنا بڑا اور گھنا ہوا تھا بہر حال مقام ابراہیم اور حجر اسود کے درمیان جہاں شدید دباؤ ہوتا ہے' پہلا چکر خیریت سے مکمل ہو گیا۔ دوسرے چکر میں بھی دباؤ قابل برداشت تھا اور مکمل ہو گیا۔ تیسرے چکر میں ہاتھ ٹوٹتے بچا' چوتھے میں پیر کی انگلی کچلی گئی پانچویں میں دوسرا ہاتھ بمشکل بچا چھٹے میں بیگم کا ہاتھ کسی کی گھڑی سے زخمی ہو گیا۔

(''اللہ کا مہمان'' از آغا امیر حسین)

آپ نے ملاحظہ کیا' اس حجاز نامے کی سب سے بڑی خوبی حقیقی مشاہدات کا بیان ہے۔ بغیر کسی بناؤ سنگھار اور تام جھام کے جو کچھ دیکھا' لکھ دیا گیا۔

آغا امیر حسین منیٰ کے میدان میں بھڑک اٹھنے والی آگ 1997ء کے بھی عینی شاہد ہیں

اور اس حوالے سے اس حجاز نامے کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ اس حوالے سے ایک اقتباس اور دیکھئے :۔

"سورج غروب ہوتے ہی تمام قافلے کوچ کے لئے تیار ہو کر بسوں میں بیٹھ گئے اب اگلا مرحلہ مزدلفہ مشعر الحرام میں رات کا وقوف تھا۔ بسوں میں بیٹھے بیٹھے تنگ آگئے ٹریفک کے زبردست دباؤ کی وجہ سے قافلے پھنسے کھڑے تھے۔ بصد مشکل دو اڑھائی گھنٹے بعد روانگی ہوئی۔ جدھر نظر پڑتی انسان ہی انسان رواں دواں دکھائی دے رہے تھے۔ حجاج کی اکثریت پیدل گامزن تھی مزدلفہ میں قیام طلوع فجر تک کا رہا یہاں کوئی خیمہ وغیرہ نہیں تھا۔ طویل وادی میں دائیں بائیں قیام کے لئے پارکنگ بنی ہوئی تھی جس کو جہاں جگہ ملی وہیں چٹائی بچھا کر لیٹ گیا ہمارے قافلے کی دو بسیں تھیں انہوں نے ہمیں سڑک پر اتارا اور خود غائب ہو گئیں یہاں فٹ پاتھ اور سڑک کا کچھ حصہ خالی تھا اس پر چٹائیاں بچھا کر مرد و زن لیٹ گئے۔ یہاں سے ہی جمرات کو مارنے کے لئے کنکریاں تلاش کرنا تھیں جو قافلے کے باقی لوگوں کے ساتھ میں نے بھی جمع کیں۔ جیسے ہی طلوع سحر ہوئی قافلہ منیٰ کی طرف چل پڑا جیسے جیسے آگے بڑھتے گئے ہجوم بڑھتا گیا بسیں 'انسان اور بیچ میں شور مچاتی ایمبولینس اور پولیس کی گاڑیاں' دیگم کے لئے پیدل چلنا بہت تکلیف دہ تھا لیکن کوئی اور حل بھی میسر نہ تھا قافلے کا جھنڈا بہت اہم ہو گیا۔ کبھی قافلے کے ساتھ ہوتے اور پھر ہجوم میں تتر بتر ہو جاتے قافلے کا جھنڈا دوبارہ اکٹھے ہونے میں مدد دیتا تمام سڑکیں ایک ہی منزل کو رواں تھیں۔ آخر کار ہم چھت والے راستے تک پہنچ گئے طویل راستہ خاص طور پر لو اور دھوپ سے بچنے کے لئے بنایا گیا ہے۔ اس میں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر جہازی سائز پنکھے لگے ہوئے تھے راستہ کم از کم سو فٹ چوڑا ہو گا۔ رکنے یا سانس لینے کی جو بھی کوشش کرے گا بچھڑ جائے گا چنانچہ سبھی چلے جا رہے ہیں جیسے تیسے یہ پیدل سفر تقریباً تین گھنٹے میں مکمل ہوا اور ہم لوگ منیٰ میں داخل ہوئے پل کبری خالد کے نیچے کیمپ 1 تا 5 پاکستان کی خیمہ بستیاں ہیں نمبر 5 میں ہمیں چھ خیمے الاٹ ہوئے ان چھ خیموں میں تقریباً 150 افراد ٹھہرے۔ منیٰ میں چند روز پہلے لگی آگ کے اثرات نمایاں تھے۔ اگرچہ حکومت نے بڑی چابک دستی سے کام لیتے ہوئے نئے خیمے لگوا دیئے تھے لیکن آگ کے اثرات کا مکمل طور پر خاتمہ ممکن نہ ہو سکا تھا یہاں ہمارے قافلے کا پڑاؤ تین روز کے لئے تھا فیصلہ ہوا کہ فوری طور پر بڑے شیطان کو کنکریاں مارنے کا فریضہ سر انجام دیا جائے چنانچہ پرچم کی سرکردگی میں قافلہ بڑے جمرے سے نمٹنے کے لئے چل پڑا وہاں ایک جم غفیر بڑے شیطان کو کنکریاں مارنے میں مصروف تھا۔ بہر حال اس فریضہ سے نمٹنے

کے بعد ہم لوگ واپس خیمے میں آئے اب یہ طے ہوا کہ قربانی آج ہی کر دی جائے چنانچہ قافلے میں جو لوگ خود قربانی کرنا چاہتے تھے میر کارواں کی سربراہی میں قربان گاہ نمبر 5 پہنچے ہم اپنے قافلہ میں سے دس بارہ افراد تھے۔ وہاں بکروں' چھتروں اور دنبوں کی قربانی کا منظر تھا۔ صبح سات بجے سے پیدل مارچ ہو رہا ہے اب مزدلفہ کے قربانی والے گیٹ پر ہوں پورا منیٰ کراس کر کے کوبری خالد (پل) پہنچنا ہے اسلئے بہتر ہے کہ فریش ہو کر مارچ کیا جائے۔ منیٰ کے شروع ہی سے کیمپ ٹاؤن آباد ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ آگ نے اس وادی کو اس طرح جھلسایا تھا کہ کوئی خیمہ جلنے سے نہ بچا۔ منیٰ میں آگ کی شدت کا اندازہ موجود صورتحال سے ہو رہا تھا۔ منیٰ سے متعلق بہت سی باتیں ذہن میں آنے لگیں کہ کس طرح جمرات کے ساتھ اللہ کی راہ میں لڑنے والے آن کر ٹھہرتے ہیں اور اسے کنکریاں مارتے ہیں لیکن کس طرح ہر سال چھوٹا بڑا حادثہ ضرور ہو جاتا ہے۔ کیا یہ محض اتفاق ہے ؟ یا پھر شیطان اللہ سے حاصل کردہ آزادی کا فائدہ اٹھا کر اپنا کام پہلے کر دیتا ہے۔ اس بار اس کا انتقام بہت شدید تھا آگ لگنے کے اسباب کچھ بھی کیوں نہ ہوں۔"

("اللہ کا مہمان" از آغا امیر حسین)

65- "سفرنامۂ حجاز" از اشرف علی قریشی

66- "بدر سے کوفے تک" از مرتضٰی حسین سید

67- "سفر حرمین" از بشیر احمد

68- "سفرنامۂ حج" از ضیاء الاسلام انصاری

69- "حدیثِ دل" از عبداللہ مالک

70- "لبیک" از ممتاز مفتی طبع اول :1975ء

واضح رہے کہ حج ناموں میں سفرناموں کی نسبت رپورتاژ کے عناصر کہیں زیادہ پائے جاتے ہیں۔ جس کی بہت نمایاں امثال آخر الذکر حج نامے "حدیثِ دل" از عبداللہ ملک اور لبیک" از ممتاز مفتی ہیں۔

***

اردو کا پہلا سفر نامہ نگار کون؟
یوسف خان کمبل پوش یا سید فدا حسین عرف نبی بخش

اول اول جس طرح مغرب میں سفر نامے کو چوسر نے "قصہ" اور "تاریخ" کہا تھا بعینہ ہمارے ہاں اردو میں اسے "تاریخ" کہا اور لکھا گیا جیسے :۔

1- "تاریخ یوسفی" از یوسف خان کمبل پوش حیدرآبادی۔

2- "تاریخِ افغانستان" از سید فدا حسین عرف نبی بخش۔

3- "تاریخِ انگلستان" از محمد مسیح الدین علوی خان۔

اول الذکر سفر نامے کے عنوان سے قارئین ادب یقیناً چونکے ہوں گے' اس لئے کہ ہمارے ہاں اردو کے اولین سفر ناموں میں سے ایک کو "عجائباتِ فرنگ" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ کچھ یہی سبب ہے کہ حال ہی میں (1983) یہ سفر نامہ ڈاکٹر تحسین فراقی اور ڈاکٹر مظفر عباس نے الگ الگ کتابی صورتوں میں "عجائباتِ فرنگ" کے نام سے مرتب کر کے شائع کروایا ہے۔

پاکستان کے اخبارات و رسائل میں اس کھوج کا سہرا ڈاکٹر تحسین فراقی اور ڈاکٹر مظفر عباس کے سر باندھنے کی خاطر اب تک خاصی روشنائی بہائی جا چکی ہے۔ یہاں تک کہ اس جدل میں اکرام چغتائی نے بھی حصہ لیا۔(1)

اکرام چغتائی نے اپنے مضمون کی تیسری قسط مطبوعہ 'نوائے وقت" راولپنڈی مورخہ 28 فروری 1984ء میں ایشیاٹک سوسائٹی بنگال' کلکتہ کے فارسی مخطوطات کی فہرست مرتبہ : ایوانوف (مطبوعہ کلکتہ 1924ء ص 124 تا 125 نمبر شمار 289) کے حوالے سے بات کرتے ہوئے سفر نامہ "تاریخ یوسفی" از یوسف خان کمبل پوش کے اصل فارسی متن کی طرف توجہ دلائی ہے۔ مذکورہ فہرست کے مطابق اس سفر نامے کا اصل فارسی متن ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانہ میں محفوظ ہے اور فارسی متن پر مصنف کا نام "یوسف خان گلیم پوش" رقم ہے۔

محولہ بالا فہرست کے مطابق اس سفر نامے کے فارسی متن کی ترتیب کا سال

1259ھ مطابق 1843ء قرار پاتا ہے۔ جبکہ یہ تحریر ملکہ وکٹوریہ اوّل کے نام معنون کی گئی۔ اس قلمی مخطوطہ کے کل اوراق 235 ہیں اور فی صفحہ گیارہ سطریں ہیں۔

ہندوستانی خطِ نستعلیق میں یہ نسخہ معمولی قسم کے نقش و نگار سے مزئین ہے۔

محولابالا مضمون میں اکرم چغتائی لکھتے ہیں۔

"1847ء میں جب یہ سفرنامہ پہلی بار دہلی کالج کے پریس میں مطبع العلوم سے طبع ہوتا ہے تو اس کا عنوان "سیر و سفر" قائم کیا جاتا ہے۔"

جبکہ در حقیقت ایسا نہیں ہے۔ مطبع العلوم مدرسہ دہلی سے شائع ہونے والا اولین اردو متن "تاریخِ یوسفی" کے نام سے ہی سامنے آیا۔

ماسٹر رام چندر نے "فوائد الناظرین" (اگست 1848ء) اور "محبِ ہند" (1849-50) نامی دو رسالوں میں اس سفرنامے کے اقتباسات بعنوان "حالِ سفر یوسف خان کمبل پوش کا ملک انگلستان میں" محض قارئین کی سہولت کے پیش نظر شائع کیے جبکہ گارساں دتاسی کے خطبات میں ہندوستان سے شائع ہونے والی بیشتر کتب کا جائزہ عموماً سرسری نوعیت کا ہی رہا ہے۔ بیشتر کتب کے سالِ تصنیف یا طباعت سے متعلق گارساں د تاسی کی فراہم کردہ معلومات گمراہ کن ہیں۔

گارساں دتاسی (De Tassy, Joseph Heliodore Sagesse Vertu Garcin پورا نام) کی ہندوستانی کتب سے متعلق معلومات کا تمام تر انحصار ان خطوط پر تھا جو وقتاً فوقتاً ہندوستان سے لکھے جاتے رہے۔ خود گارساں دتاسی نے زندگی بھر ہندوستان کی سرزمین پر قدم نہیں رکھا۔ یوں دتاسی کے پانچویں خطبہ (۴ دسمبر ۱۸۵۴ء) اور چھٹے خطبہ (۳ دسمبر ۱۸۵۵ء) کو تاریخ یوسفی کے سلسلے میں اہم مصادر کی حیثیت نہیں مل سکتی۔ جبکہ دتاسی نے اپنے پانچویں خطبہ میں محض ناقص معلومات کے سبب "تاریخ یوسفی" کو "سفرنامہ یوسف خان لکھنوی" اور چھٹے خطبہ میں "سفرنامہ یورپ" لکھا ہے۔ کچھ یہی سبب ہے کہ اس سفرنامے کے اصل اردو متن کا معاملہ تاحال کھٹائی میں پڑا ہوا ہے۔

حقیقتِ حال یہ ہے کہ یوسف خان کمبل پوش حیدرآبادی کا یہ سفرنامہ پہلی بار "تاریخِ یوسفی" کے نام سے پنڈت دھرم نرائن کے زیرِ اہتمام مطبع العلوم مدرسہ دہلی سے شائع ہوا تھا۔ "تاریخِ یوسفی" کا سنہ طباعت 1263ھ مطابق 1847ء ہے۔ کتاب کے سرورق پر کتاب کا نام :۔

"تاریخِ یوسفی (سفرنامہ انگلستان یوسف خان کمبل پوش)" اور مصنف کا نام۔

"یوسف خان کمبل پوش حیدرآبادی" درج ہے۔

تاریخ یوسفی 297 صفحات پر مشتمل کتاب ہے جس میں عام طور پر صحتِ کتابت کا خیال رکھا گیا ہے البتہ املا میں یائے معروف و مجہول کا لحاظ نہیں کیا گیا۔ کتاب میں پرانی ترکیبیں جابجا ملتی ہیں۔

منشی نولکشور نے 1873ء میں اس سفر نامے کا نام "تاریخ یوسفی" سے تبدیل کر کے "عجائباتِ فرنگ" کر دیا اور مصنف کے نام کا ایک حصہ حذف کر کے صرف "یوسف خان کمبل پوش" رہنے دیا۔ یہی صورت 1898ء کے نولکشوری ایڈیشن میں بھی برقرار رکھی گئی۔

نولکشور لکھنؤ جیسے نامی ادارے نے اصل متن کا چہرہ بگاڑنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ ذیل میں اصل متن مطبوعہ: مطبع العلوم مدرسہ دہلی 1847ء سے تحسین فراقی اور مظفر عباس کے متن کا فرق ملاحظہ ہو:

"عجائبات فرنگ" مرتبہ تحسین فراقی، مظفر عباس۔
تحقیق کی بنیاد: نولکشوری ایڈیشن 1873ء، 1898ء

آغاز حالِ مؤلف

"یہ فقیر بیچ سن اٹھارہ سو اٹھائیس ۱۸۲۸ء مطابق سن بارہ سو چوالیس ہجری کے حیدرآباد وطن خاص اپنے کو چھوڑ کر عظیم آباد، ڈھاکہ، مچھلی بندر، مندراج، گورکپور، اکبرآباد، شاہجہان آباد وغیرہ دیکھتا ہوا بیت السلطنت لکھنؤ میں پہنچا۔ یہاں بہ مددگاری نصیبے اور یاوری کپتان ممتاز خان مینکس صاحب بہادر کی ملازمت نصیر الدین حیدر بادشاہ سے عزت پانے والا ہوا۔ شاہ سلیمان جاہ نے ایسی عنایت اور خاوندی میرے حال پر اختلال پر مبذول فرمائی کہ ہرگز نہیں تابِ بیان اور یارائے گویائی۔ رسالۂ خاص سلیمانی میں عہدہ جماعہ داری کا دیا۔ بعد چند روز کے صوبہ داری اسی رسالہ کے دے کر درماہہ ٹھہرایا۔ بندہ چین سے زندگی بسر کرتا اور شکرانہ منعم حقیقی بجا لاتا۔ ناگہاں شوق تحصیلِ علم انگریزی کا دامنگیر ہوا۔ بہت محنت کر کے تھوڑے دنوں میں اسے حاصل کیا۔ بعد اس کے بیشتر کتابوں تواریخ کی سیر کرتا۔ دیکھنے حال شہروں اور راہ و رسم ملکوں سے محظوظ ہوتا۔ اکبارگی سن اٹھارہ سو چھتیس عیسوی میں میرا دل طلب گارِ سیاحئ جہان خصوص ملک انگلستان کا ہوا۔ شاہ سلیمان جاہ سے اظہار کر کے رخصت دو برس کی مانگی۔ شاہِ گردوں بارہ گاہ نے بعد عنایت وانعام اجازت دی۔ عاجز تسلیمات بجا لایا۔ اور راہی منزلِ مقصود کا ہوا۔ تھوڑے دنوں بعد دارالامارۃ کلکتہ پہنچا۔ پانچ چھ مہینے وہاں کی سیر کرتا رہا۔ بعد ازاں جمعرات کے دن تیسویں تاریخ مارچ کے مہینے سن اٹھارہ سو سینتیس عیسوی

میں جہاز پر سوار ہو کر بیت السلطنت انگلستان کو چلا۔ نام جہاز کا ازابیلہ 'کپتان اس کا نام ڈیڈبر ان صاحب مع اپنی بی بی کے تھا۔ جہاز وزن میں چھ سو ٹن کا کنارے گنگا پر آلگا تھا۔ یہاں سے دریائے شور پہنچنے تک اس کی اعانت کو دھوئیں کا جہاز مقرر ہوا۔ تھوڑے دنوں میں اپنے زور سے ہمارے جہاز ازابیلہ کو گنگا سے کھینچ کر سمندر میں لے گیا۔ وہاں سے جہاز ہمارا اچل نکلا"۔

اب ملاحظہ ہو اصل متن "تاریخِ یوسفی":

آغاز حالِ مؤلف

"یہ فقیر بیچ سنہ اٹھارہ سو اٹھائیس عیسوی مطابق سنہ بارہ سو چوالیس ہجری کے حیدرآباد وطن خاص اپنے کو چھوڑ کر عظیم آباد' ڈھاکا' مچھلی بندر' مندراج' گورکھپور' نیپال' اکبر آباد' شاہجہان آباد وغیرہ دیکھتا ہوا بیت السلطنت لکھنو میں پہنچا۔ یہاں بمدد گاری نصیبی اور یاوری کپتان ممتاز خان 'میکنس صاحب بہادر کے' ملازمت نصیرالدین حیدر باد شاہ سے عزت پانے والا ہوا۔ شاہ سلیمان جاہ نے ایسی عنایت اور خاوندی میرے حالِ پر اختلال پر مبذول فرمائی کہ نہیں تاب بیان اور یارائے گویائی۔ رسالۂ خاص سلیمانی میں عہدہ جمعدداری کا دیا' بعد چندروز کے صوبہ داری اسی رسالے کی دے کر درماہہ بڑھایا۔ بعدہ چین سے زندگی بسر کرتا اور شکرانہ منعمِ حقیقی کا بجالاتا' ناگہاں شوق تحصیل علم انگریزی کا دامن گیر حال ہوا' بہت محنت کر کے تھوڑے دنوں میں اسے حاصل کیا' بعد اس کے بیشتر کتابوں تواریخ کی سیر کرتا۔ دیکھنے حال شہروں اور راہ ورسم ملکوں سے محظوظ ہوتا۔ اکبارگی سنہ اٹھارہ سو چھتیس عیسوی میں میرا دل طلب گار سیاحیٔ جہان خصوص ملک انگلستان کا ہوا۔ شاہ سلیمان جاہ سے اظہار کر کے رخصت دو برس کی مانگی۔ شاہ گردوں بارگاہ نے بصد عنایت وانعام اجازت دی' عاجز تسلیمات بجالایا' اور راہی منزل مقصود کا ہوا۔ تھوڑے دنوں بعد دارالامارۃ کلکتے میں پہنچا۔ پانچ چھ مہینے وہاں کی سیر کرتا رہا۔ بعد ازاں جمعرات کے دن تیسویں تاریخ مارچ کے مہینے سنہ اٹھارہ سو سیں تیس عیسوی میں جہاز پر سوار ہو کر بیت السلطنت انگلستان کو چلا۔ نام جہاز کا "ازابیلہ" کپتان اس کا ڈیڈبرن صاحب مع اپنی بی بی کے تھا۔ جہاز وزن میں چھ سو ٹن کا کنارے گنگا پر لگا تھا' یہاں سے دریائے شور پہنچنے تک اس کی اعانت کو دھوئیں کا جہاز مقرر ہوا۔ تھوڑے دنوں میں اپنے زور سے ہمارے جہاز ازابیلہ کو گنگا سے کھینچ کر سمندر میں لے گیا' وہاں سے جہاز ہمارا اچل نکلا۔"

"تاریخِ یوسفی" مطبوعہ: مطبع العلوم مدرسہ' دہلی' بار اوّل: 1847ء

نوٹ :۔

ڈاکٹر تحسین فراقی اور ڈاکٹر مظفر عباس کے پیش کردہ متن پر اصل متن کے فرق کو ظاہر کرنے کے لئے لکیریں (______) کھینچ دی گئی ہیں۔

یوسف خان کمبل پوش حیدرآبادی کے مربّی نواب نصیر الدین حیدر (شاہ اودھ) یورپی تہذیب و معاشرت پر سو جان سے فدا تھے۔ یہی سبب ہے کہ کمبل پوش کو دو برس کی رخصت برائے سیر و سیاحت اور انعام واکرام سے نوازا گیا۔ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ کمبل پوش نے شاہ اودھ کی اپنی خواہش کے تحت یہ سفر اختیار کیا ہو۔ اس حقیقت سے کامل آگہی کے لئے مجلّہ "ہمایوں" اگست 1940ء کے مستقل عنوان "محفلِ ادب" سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو :

"نواب نصیر الدین حیدر شاہ اودھ کو یورپینوں سے غیر معمولی دلچسپی تھی چنانچہ نواب نصیر الدین حیدر کے تقریباً تمام مصاحب یورپین تھے۔ شاہ اودھ کی اس مغرب پرستی کو امرائے اودھ اگرچہ پسند نہ کرتے تھے لیکن شاہ اودھ کی حالت یہ تھی کہ دن رات ناکارہ اور اوباش یورپین ان کو گھیرے رہتے تھے۔"

مضمون نگار نے نصیر الدین حیدر کے ایک یورپین مصاحب ہلٹن کی ڈائری سے چند اوراق ترجمہ کر کے نقل کر دیئے ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو :

"بادشاہ نے میرے دوست سے پوچھا۔ کیوں جی انگلستان میں تم مسٹر اسمتھ سے بھی ملوگے کہ نہیں ؟"

مسٹر آر نے عرض کیا کہ "میں ان سے ضرور ملوں گا۔ کیونکہ ان سے کچھ کام بھی ہے۔" تب بادشاہ نے اپنی نہایت خوبصورت اور مرصع گھڑی جو ایک اعلیٰ درجے کے کاریگر کی بنائی ہوئی تھی اور پندرہ ہزار فرانک میں آئی تھی، مع زنجیر مرصع اپنے گلے سے اتار کر اپنے دستِ مبارک سے مسٹر آر کے گلے میں ڈال دی اور ہکلا ہکلا کے فرمایا کہ :"بھئی دیکھو! قطعی وعدہ کرو کہ یہ گھڑی مع زنجیر جلسہ تم اسمتھ صاحب کی میم صاحبہ کے گلے میں پہنادو گے۔ اسی طرح پہنانا جیسے میں نے تمہارے گلے میں پہنائی ہے، دیکھو وعدہ کا خیال رکھنا۔"

(ہمایوں۔ اگست 1940ء ص 609 سے اقتباس)

یوسف خان کمبل پوش کی افتادِ طبع اور تبدیلی فکر سے متعلق تذکرہ "غوثیہ" (2) (روایت، مرید خاص شاہ گل حسین، مرقومہ، مولوی اسمٰعیل میرٹھی) کو ایک اہم ماخذ شمار کیا جاتا ہے۔ یہ سوال اپنی جگہ کہ حضرت سیدّ غوث علی شاہ قلندرؒ کی رحلت کے چار برس بعد

مرتب ہونے والی کتاب میں روایت اور یاداشتوں کو تحقیق میں کس حد تک قابل اعتبار اور حتمی شمار کیا جاسکتا ہے ؟

"تذکرہ غوثیہ" سے اس بات کی کثیر شہادتیں ملتی ہیں کہ حضرت سید غوث علی شاہؒ جس زمانے میں جمنا کے کنارے زینت المساجد (دہلی) میں قیام پذیر تھے' وہاں ان کی ملاقات کمبل پوش سے بھی رہی۔ باہم دوستانہ بے تکلفی تھی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب یوسف خان کمبل پوش کا قیام باقی باللہ صاحب میں تھا۔ قیاس غالب ہے کہ یہ زمانہ لگ بھگ 1840ء کے بعد کا رہا ہوگا۔ کمبل پوش انگلستان' فرانس اور مصر سے ہوتے ہوئے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتے ہندوستان پلٹے تھے اور ان میں فکری سطح پر خاصی اہم تبدیلیاں روپذیر ہوئی تھیں۔

"تذکرۂ غوثیہ" سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں :

1- "ایک روز ارشاد ہوا کہ جب ہم دہلی کی زنیت المساجد میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہمارے دوست کمبل پوش نے (جو شاہ باقی باللہ صاحب میں رہتے تھے) ہماری دعوت کی' مغرب کے بعد ہم کو لے کر چلے۔ چاندنی چوک میں پہنچ کر ایک طوائف کے کوٹھے پر ہم کو بٹھادیا اور آپ چنپت ہوگئے۔ پہلے تو ہم نے خیال کیا کہ شاید کھانا اسی جگہ پکوایا ہوگا۔ مگر پھر معلوم ہوا کہ یوں ہی بٹھا کر چل دیا ہے۔ ہم بہت گھبرائے کہ بھلا ایسی جگہ کم بخت کیوں لایا۔ دو گھڑی کے بعد ہنستا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ میاں صاحب میں آپ کی بھڑک مٹانے کو یہاں بٹھا گیا تھا۔ بعدہ اپنے قیام گاہ لے گیا اور کھانا کھلایا۔"

2- "باقر شاہ نے کمبل پوش سے سوال کیا کہ تمہارے نزدیک کفر و اسلام میں کچھ فرق ہے یا نہیں۔ جواب دیا کہ کچھ بھی نہیں دونوں شانیں سرکاری ہیں۔ اندھیرے اجالے کا سا حال ہے"۔

کفر و اسلام در رہش پویاں
وحدہٗ لا شریک لہ گویاں

پھر پوچھا کہ تم کس طریقہ میں ہو۔ کہا کہ کسی میں بھی نہیں "سردی میں دھوپ بھلی معلوم ہوتی ہے اور گرمی میں چھاؤں۔ دن کو اجالا اچھا لگتا ہے اور رات کو اندھیرا۔"

3- "جب ہم دہلی کی زینت المساجد میں تھے تو وہاں ایک شخص غلام فرید نام کے نہایت بھولے آدمی رہتے تھے مگر پیری مریدی کا ان کو بڑا شوق تھا۔ ایک دن کمبل پوش سے کہنے لگے کہ او کمبل پوش تو کسی کا مرید بھی ہے۔ وہ بولا کہ اے پیر! بھلا مجھ کو کون

مرید کرتا ہے۔ میاں غلام فرید نے کہا کہ آمیں تجھ کو مرید کروں۔ میں نے کہا کہ میاں صاحب آپ کیا کرتے ہیں۔ اس کے دم میں نہ آجانا۔ یہ سارے جہان کا چھٹا ہوا غنڈہ ہے۔ ملک ملک پھرا ہے۔ ہفت زبان جانتا ہے۔ ہم تم جیسوں کو تو بازار میں کھڑا ہو کر بیچ ڈالے۔ بھلا تم کس کے فریب میں آگئے۔ اس کے جواب میں میاں غلام فرید کیا کہتے ہیں کہ نہیں جی اس کو اعتقاد آگیا ہے۔ کمبل پوش بولا 'ہاں پیر مجھے تو بہت ہی اعتقاد ہے' میری ایسی قسمت کہاں جو تم مرید کر لو۔ میاں غلام فرید نے جھٹ ایک روپیہ کی شرینی اپنے پاس سے منگائی۔ شیرینی کو دیکھ کر کمبل پوش بولا کہ پیر جی میں بہت بھوکا ہوں۔"

"تذکرہ غوثیہ" کے مطابق ایک بار حضرت غوث علی شاہ قلندرؒ کے سامنے کمبل پوش نے مندرجہ ذیل اشعار پڑھے تو حضرت صاحب نے گرفت کی۔ اشعار ملاحظہ ہوں :

ملکِ خدا میں یارو آباد ہیں تو ہم ہیں
تعمیر دو جہاں کی بجاد ہیں تو ہم ہیں

دیکھا پرکھ پرکھ کے آخر پڑا نظر یہ
گر نقد ہیں تو ہم ہیں نقاد ہیں تو ہم ہیں

حضرت صاحب نے استفسار کیا کہ "پڑا نظر یہ" (یعنی نظر پڑا) سے کیا مراد ہے تو کمبل پوش نے جواب دیا "انسان" اس پر حضرت صاحب نے فرمایا "یہاں قلب" مراد ہے۔ کمبل پوش نے کوئی بحث نہیں کی اور کہا "بے شک اس کے یہی معنی ہیں۔ یہاں "انسان" بھی مراد لیا جاسکتا ہے"

حضرت صاحب نے "قلب" کہہ کر سلسلہ چشتیہ کی راہ (یعنی طریقت) کی طرف بات کا رخ موڑ دیا تھا۔ "قلب" کا ذکر "ذکرِ قلبی" ہوگا' منزل "ملکوت" ہو گی اور مرتبہ "قلب" یا "دل" ہوگا۔

یہ فکری انتشار ہی تھا کہ کمبل پوش نے بحث کو آگے نہیں بڑھایا۔ یہ اس کے باوجود ہوا کہ کمبل پوش کی نظر ہر نوع کے صوفیانہ معاملات پر بہت گہری تھی اور وہ مثنوی مولانا روم کے صوفیانہ اسرار درموز سے بھی خوبی واقف تھا۔

کمبل پوش 'کفر اور اسلام میں زیادہ فرق نہیں کرتا تھا اس کے باوجو اس کا ذاتِ واحد پر پختہ ایمان تھا۔ وہ اپنے آپ کو ہمیشہ بنو ہاشم سے بتاتا اور اپنے آپ کو آلِ محمدؐ کا ہی فرد قرار دیتا تھا۔ یہاں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ انکار کی مختلف صورتیں کیا کیا ہیں۔

"تاریخ یوسفی" سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کمبل پوش کی وسیع المشربی کے سبب اس کی بعض عادات و خصائل اہل ظاہر کی نظروں میں ہمیشہ ناپسندیدہ رہے۔ کمبل پوش آخرت پر کامل یقین رکھتا ہے (تاریخ یوسفی ص 167) خلق خدا کی خدمت کو "انسانیت" اور انسانیت کو خدائی مذہب قرار دیتا ہے (ص 158۔ 159) وہ جمال پرست' مے نوش اور مغرب کی تہذیبی برتری کا معترف تھا۔

یوسف خان کمبل پوش نے اپنے سفرنامہ میں فرنگی مرد اور عورتوں کا ذکر کیا ہے جن کا مذہب انہیں پسند آیا۔ کمبل پوش نے اس مذہب کو "سلیمانی مذہب" لکھا ہے۔ سلیم احمد لکھتے ہیں کہ کمبل پوش اس مذہب سے اس درجہ متاثر تھے کہ ہندوستان پلٹنے پر اپنی پہچان "کمبل پوش سلیمانی" کے نام سے کروانا چاہتے تھے۔(3)

افسوس کہ سلیم احمد نے سفرنامہ کے متن کا مطالعہ نہیں کیا۔ جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ کمبل پوش کے سفر یورپ کا آغاز 1830ء بتاتے ہیں جبکہ سفرنامہ کے آغاز میں ہی کمبل پوش نے اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ سفر کا آغاز 30 مارچ 1837ء میں ہوا۔

دوسری بات یہ کہ مذکورہ مذہبی عقیدے کو "عقلیت پرستی" کہیں یا "سلیمانی مذہب" سلیم احمد نے اسے "مذہبی فیشن" اور "ڈی ازم" کا نام دیا ہے۔ اس حوالے سے بات کرتے ہوئے انہوں نے کمبل پوش کو سرسید احمد خان کا پیشرو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ سلیم احمد لکھتے ہیں:

"دراصل یہ وہی مذہبی فیشن ہے جسے ڈی ازم کہا جاتا ہے۔ ڈی ازم کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا اور کائنات کا تعلق ایسا ہے جیسے گھڑی اور گھڑی ساز کا۔ گھڑی ساز نے گھڑی بنا دی۔ اب گھڑی اپنے کل پرزوں کی مدد سے چل رہی ہے' گھڑی ساز کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ سرسید کے قانونِ فطرت کا تصور بھی یہی ہے۔"

(ص 31 اقتباس)

آگے چل کر لکھتے ہیں:

"چنانچہ سرسید اور حالی نے جب ان خیالات کا اظہار کیا تو نہ صرف بڑی واہ واہ ہوئی بلکہ انہیں عہد جدید کے اماموں میں تسلیم کر لیا گیا۔"

(ص 32 سے اقتباس)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا سرسید احمد خان کے افکار سامنے آنے پر واقعی

''واہ وا'' ہوئی؟ ہندوستان کے مفتیوں نے سرسید احمد خان کے لئے ضرب و حبس کی سزا تجویز کی اور واجب القتل' قرار دیا۔

بقول الطاف حسین حالی ''بعض سر پھروں نے سیدؔ کو قتل کرنے کی تیاری بھی کر لی تھی۔ مگر وہ ایسا کر نہ سکے البتہ گالیوں اور دھمکیوں کے خطوط سیدؔ احمد خان کو ہر روز موصول ہوتے تھے۔'' (4)

جہاں تک کمبل پوش اور سرسید احمد خان کے ہم مسلک ہونے کا تعلق ہے اس میں تشکیک کے عنصر کو بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔ سرسید احمد خان کا اجتہاد عمومی طور پر سیاسی حکمت عملی کا نتیجہ تھا۔ انہوں نے لندن پلٹ ہونے کے باوجود ''تہذیب الاخلاق'' کا اجرا کیا اور اپنی وضع نہیں بدلی جبکہ کمبل پوش کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ پھر سرسید احمد خان کی طرز کے افکار کے رد میں ''الرد الالدہریون'' (مطبوعہ: بیروت) شائع ہوئی تھی جس میں یونان کے ایٹمی فلسفیوں سے وارڈن اور مزدک سے روسو' اہل یہود سے فری میسن تنظیم' اسماعیلیوں سے مورمنوں' لبرل سیاست سے سوشلزم و کمیونزم تک ہر فکر' فلسفے اور تحریک کو ''نیچری'' ثابت کیا گیا تھا۔ ان رد کئے گئے نظریات' افکار و اعتقادات میں سے اکثر کے ڈانڈے ''فلسفہ وجودیت'' سے آملتے ہیں جبکہ کمبل پوش کے پاس ''فلسفۂ وجودیت'' کے دفاع میں کہنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔

سرسید احمد خان کی دیو قامت شخصیت کا مطالعہ جائے خود ہندوستان کی نئی فکری جہات کا مطالعہ ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تاحال سرسید کے فکری زاویے لائقِ توجہ ہیں اور ان پر کام کرنے کے لئے سازگار ماحول میسر نہیں آیا۔

سلیم احمد کے محولہ بالا بیان کی فکری سپلائی لائن محمد حسن عسکری صاحب کی نظریہ سازی ہے۔ (5) جو ''تذکرۂ غوثیہ'' کو بنیاد بنا کر میر تقی میر کے حق میں غالب کشی تک پہنچی ہوئی تھی۔ (6)

اب آیئے ''تاریخِ افغانستان'' از سید فدا حسین عرف نبی بخش کی جانب۔ یہ قدیم ترین سفرنامہ ایک جنگی مہم سے متعلق ہے۔ اس سفرنامے میں سفر کا آغاز 25 شعبان 1255ھ مطابق 3 نومبر 1839ء کو شاہجہان سے کابل کی طرف چڑھائی سے ہوتا ہے۔ یہ سفرنامہ داستانوی آنگ لئے ہوئے ہے اور روزنامچے کے انداز میں لکھا گیا ہے۔

بغور دیکھیں تو اس کی طرز تحریر میں ''تاریخ یوسفی'' از یوسف خان کمبل پوش کے مقابلے میں قدامت اور ثقالت کا احساس ہوتا ہے۔ حال آنکہ یوسف خان کمبل پوش حیدرآبادی

نے 1244ھ مطابق 1828ء میں سفر اختیار کیا اور سید فدا حسین عرف نبی بخش نے 1255ھ بہ مطابق 1839ء کی روداد بیان کی ہے۔ لیکن کسی تحریر یا تصنیف کی قدامت کا انحصار ہمیشہ زمانہء تصنیف پر ہوتا ہے۔ یوں ان دونوں تصانیف کا باہم مقابلہ کریں تو پتا چلتا ہے کہ "تاریخِ افغانستان" کے نمونۂ عبارت میں ثقالت کا سبب اس کا زمانہ تصنیف ہی ہے۔ یوسف خان کمبل پوش نے سفر (1828ء) کا آغاز بلاشبہ پہلے کیا، لیکن "تاریخ افغانستان" از سید فدا حسین کا زمانہ تصنیف و طباعت 1839ء ہے اور "تاریخ یوسفی" از یوسف خان کمبل پوش کا زمانہ تصنیف لگ بھگ 1846ء اور سنہ طباعت 1847ء۔

یوں زمانۂ تصنیف اور سنہ طباعت کے اعتبار سے "تاریخ افغانستان" کو "تاریخ یوسفی" پر پانچ تا چھ برس کا زمانی تفوق حاصل ہے۔ نیز تحریر کی ثقالت اور روزنامچہ تحریر کرنے کی تواریخ کے داخلی شواہد یعنی سنین کے مطابق اردو کا پہلا سفر نامہ نگار سید فدا حسین عرف نبی بخش ہی قرار پاتا ہے اور اردو کا پہلا سفر نامہ "تاریخ افغانستان" ہے نہ کہ "تاریخ یوسفی" المعروف "عجائباتِ فرنگ"۔

اب اردو کے پہلے سفر نامہ "تاریخ افغانستان" سنہ تصنیف و طباعت 1255ھ بمطابق 1839ء کا موازنہ "فسانۂ عجائب" از رجب علی بیگ سرور لکھنوی سنہ تصنیف 1240ھ بہ مطابق 1824ء سے کیجئے۔ آپ طرزِ تحریر میں اس حد تک مماثلت پائیں گے کہ پہچان اور تخصیص مشکل ہو جائے گی۔ دیکھیے "تاریخِ افغانستان" سے نمونۂ عبارت :۔

"امابعد' یہ آوارہ عاجز و ناکارہ درماندہ درافتادہ سید فدا حسین عرف نبی بخش بخاری الحیدری نسب علاقہ روزگار سرکار انگریزی میں بعہدہ جمعداری ترک سواروں میں ملازم ہوا تھا۔ زمانۂ ناہنجار کہ ہر روز بازی تازہ بروئے کار لاتا ہے اور شعبدہ نیا اٹھاتا ہے' چناں چہ صاحبانِ عالی شان کو حمایت شاہ شجاع درانی بادشاہ کابل کے مہم اس ملک کی اور بادشاہ کرنا اس کا مصمم ہوا' اور رسالہ ہمارا مقام چھاؤنی میرٹھ سے اس مہم میں مقرر ہوا' عاصی بھی چارو ناچار بندگی بےچارگی مثل مشہور ہے سب دوست و یگانہ سے رخصت ہو کر مستعد و آمادۂ سفر ہوا۔ تاریخ 3 ماہ نومبر 1839 عیسوی مطابق 25 شعبان 1255 ہجری کو شاہ جہاں آباد سے دو تین منزل آگے گئی تھی کہ قضائے الٰہی سے بیماری ہیضہ وبا کی فوج میں پڑ گئی......

اب پھر آیا میں اوپر مطلب اپنے کے عرض بیچ خدمت سامعانِ کتاب کے یہ ہے کہ دس ہزار فوج لڑائی پر گئی سب ماری گئی۔ ے ہزار آدمی وہاں سے بچ کر آگئے اور باقی مدفون

ہوئے۔"

("تاریخِ افغانستان" از سید فدا حسین عرف نبی بخش)

"تاریخِ یوسفی" المعروف "عجائبات فرنگ" از یوسف خان کمبل پوش حیدر آبادی کے سنہ طباعت 1847ء تک آتے آتے تو رجب علی بیگ سرور بھی نسبتاً سہل دکھائی دینے لگتے ہیں۔

سنہ ترجمہ 1847ء سے اقتباس :۔

"راویانِ اخبار و حاکیانِ آثار متفق ہیں کہ پہلے جس نے گلزار بے ثبات میں روشِ سلطنت نکالی، تخت و تاج کی بنا ڈالی، عدل و داد کو رواج دیا، محصول و خراج لیا، وہ کیومرث تھا، بیٹا اس کا سیامک نام تھا۔ اس کو عبادت کے سوا اور نہ کچھ کام تھا، دیو نے اس کو مارا، کیومرث کو بہت قلق ہوا، ہوشنگ سامک کا بیٹا تھا، اس نے باپ کے خون کا بدلہ لیا، دیو کو قتل کیا، تیس برس کیومرث نے سلطنت کی، پھر دارِ فنا سے رحلت کی، یہ قول فردوسی ہے۔ اس نام کی تحقیق میں کیومرث کا فارسی اخیر تاء فوقانی، اور ائمہ اخبار نے اختلاف کیا ہے۔ امام غزالی نے اس وادی سے رم کیا ہے۔ بزرگ ترین اولادِ صلبی آدم لکھا ہے۔ بعض کہتے ہیں ولیم بن لاوئن سام بن نوح ہے۔ اور مصنف روضۃ الصفا لکھتا ہے کہ یافث بن نوح کا بیٹا ہے۔ عرب اس کا عامر عجم کیومرث کہتے ہیں۔ اور علمائے مجوس آدم اسی کو جانتے ہیں کلشاہ کہکے مانتے ہیں۔ ہزار برس کا سن اور چالیس برس سلطنت کے دن۔"

("ترجمۂ شمشیر خانی موسوم بہ سرور سلطانی" سے اقتباس)

ثابت ہوا کہ 1839ء تا 1847ء اردو نثر نے ثقالت سے سادگی کی جانب ایک اہم موڑ کاٹا۔

***

دیگر قدیم سفر نامے

"تاریخ افغانستان" از سید فدا حسین عرف نبی بخش اور "تاریخ یوسفی" از یوسف خان کمبل پوش کے بعد اردو کا تیسرا قدیم ترین سفر نامہ "سفر فرنگ" از میرزا ابو طالب خان اصفہانی (آغازِ سفر 1856ء) ہندوستانی مزاج لئے ہوئے ہے۔ حال آنکہ یہ "مسیر طالبی" کا ترجمہ ہے۔ جبکہ چوتھا قدیم ترین سفر نامہ مولوی مسیح الدین علوی خان کا "تاریخِ انگلستان" ہے۔ مولوی صاحب کا یہ سفر واجد علی شاہ اختر کی سیاسی حیثیت کو استحکام بخشنے کی خاطر کیا گیا۔ مولوی صاحب سابق میر منشی گورنر جنرل تھے۔ جو 1856ء میں اودھ کے معزول نواب واجد علی شاہ اختر کی والدہ ان کے بھائی اور بیٹے کے ہمراہ بطور سفیر برطانیہ گئے اور سات برس تک وہیں مقیم رہے۔ ہندوستان واپسی پر ان کا یہ سفر نامہ 1863ء میں مکمل ہوا۔ واضح رہے کہ ہمارے محققین نے مولوی صاحب کے سفر نامہ "تاریخ انگلستان" کو "سفیر اودھ" کے نام سے یاد کیا ہے حالانکہ "سفیر اودھ" ان کی خود نوشت ہے جو الناظر پریس لکھنو سے 1929ء میں شائع ہوئی۔

سفر نامہ "تاریخ انگلستان" سے عبارت ملاحظہ ہو:۔

"ایک صاحب مرشد آباد کے جج تھے وہ قائم مقام اجنٹ گورنر جنرل ہو گئے اور بعضے وجوہ سے جس کی شرح یہاں عبث اور طول ہے وہ مجھ سے کچھ ناراض تھے اونھون نے ہجر واجلاس کے جو خطوط میری معزولی کے باب میں دونوں عہدوں سے نظامت سے آئے تھے اور مسٹر ہنری طارنس نے جواب اوس کا نہیں لکھا تھا منظوری کا جواب لکھ کے بھیج دیا۔ اس سبب سے مجھکو نہایت دغدغہ پیدا ہوا کہ واصلات کے بکھیڑے میں مجھکو لوگ بہت زحمت دیں گے اس عرصہ میں کپتان مگر یگر نام ایک صاحب مستقل گورنر جنرل کے اجنٹ مقرر ہوے یہ صاحب پچھلے دنوں میں لارڈ اکلنڈ کے مصاحب تھے جب راقم فارسی دفتر کا میر منشی تھا مجھکو خوب جانتے تھے راقم چھ مہینے سے زیادہ واصلات سمجھانے کے انتظار میں وہاں مقیم رہا اور باوصف اون کی تاکید کے کسی نے واصلات نہ سمجھی اور اونھون نے اہالی دفتر سے بالا بالا تحقیقات کر کے میری بے لوثی پر یقین کیا اور مجھے اجازت دی کہ تم جہان جی چاہے چلے جاؤ ساری کیفیت اس کی بھی بہت طول ہے کچھ اوس کے ذکر کرنے سے فائدہ نہین ہے۔ اس

عرصہ میں لکھنو سے میری بتاکید طلب ہوئی اور در صورت تاخیر کے احتمال ضرر کا تھا چنانچہ بنظر نہایت تاکید کے ایک ہزار روپیہ میرے مصارف راہ کے واسطے گیا مگر اوسی واصلات سمجھانے میں مجھکو اس قدر تاخیر ہوئی کہ موجب نارضامندی وہان کے ارباب اقتدار کا ہوا اور وہ ہزار روپیہ پھیر دینا پڑا اور اگر مین فوراً طلب کے وقت یہان پہنچ جاتا تو ظن غالب بہت ترقی کا تھا بسبب تاخیر کے کچھ ظہور مین نہ آیا۔ قریب دو برس کے مین خانہ نشین رہا کہ اتنے مین اودھ کی سلطنت سرکار انگریزیہ نے ضبط کرلی جس دن ضبطی کا حکم بادشاہ کو سنایا گیا راقم اپنی گھر مین تھا...... بتاکید میری طلب ہوئی اور بادشاہ نے اپنے پاس مجھے بلا کے نہایت تاکید سے دوسرے یا تیسرے دن ضبطی کے مجھے کلکتہ کی روانگی کا حکم دیا یہانتک تاکید تھی کہ اوسی طرف سے مین روانہ ہو جاؤن اور پھر گھر مین نہ جاؤن ایسے اضطراب مین مجھکو روانہ کیا کہ طبیعت نہایت منتشر ہوئی مین مخفی ایک شب کے واسطے اپنے عزیزوں سے رخصت ہونے کے لئے گھر مین آیا اوس کی صبح کو کلکتہ کی طرف روانہ ہوا اور بادشاہ کو اون کے خیر طلبون نے صلاح دی تھی کہ بذات خود انگلستان کی طرف روانہ ہوں اور مرافعہ اپنی مظلومی کا ملکہ معظمہ کے حضور مین اور پارلیمنٹ مین بذات خود اصالتاً پیش کریں۔ حقیقت مین یہ رائے بادشاہ کے واسطے بہت بہتر تھی اگر ایسا کرتے دو برس جو لوگون نے قلعہ مین رہنے سے مصیبت جھیلی اوس سے محفوظ رہتے اور غالب گمان قریب بہ یقین کے ہے کہ جو مآل اب بادشاہ کے واسطے ہوا اوس سے ہمراتب بہتر ہوتا۔ الغرض پہلے تو بادشاہ نے اسی عزیمت پر کلکتہ کی روانگی کا قصد کیا چنانچہ اسی کے بندوبست کے واسطے پہلے راقم کو روانہ کیا اور تھوڑے دنوں کے بعد خود بھی روانہ ہو رہے مگر چونکہ جبلت سے ضعیف القلب ہین اور دریا کے سفر سے اون کو نہایت خوف و خطر تھا کلکتہ مین پہونچ کے رائے بدل گئی اپنی عزیمت موقوف کی ملکہ کشور اپنی والدہ ماجدہ کو اور مرزا حامد علی بہادر ولی عہد کو اور مرزا جواد علی سکندر حشمت اپنے بھائی کو جو اپنے باپ کے وقت مین جنرل کہلاتے تھے ولایت کی روانگی کے واسطے تجویز کیا اور راقم کو سفیر مقرر کیا اور حضرت ملکۂ معظمہ دام اقبالہا کے نام پر عریضہ لکھا تھا اوس مین یہ لکھا کہ مین نے اپنی والدہ اور اپنے بیٹے اور اپنے بھائی کو صرف حضور کی دربارداری کے واسطے روانہ کیا ہے اور مولوی محمد مسیح الدین خان بہادر کو جو اس سیہ کار کا نام ہے اپنا مختار اور وکیل استغاثہ پیش کرنے کے واسطے مقرر کیا ہے اون تینون آدمیون کو مطلق کچھ میرے مقدمہ سے اور دعوے سے علاقہ نہیں ہے اوس کا انجام اور انصرام صرف میرا وکیل بذات خود کریگا فقط۔ اور قبل روانگی کے راقم نے بادشاہ کے حضور مین عرض کیا کہ جس امر کے واسطے قبلہ عالم فدوی کو اور اپنے

عزیزوں کو اس سفر دور دراز مین بھیجتے ہیں بہت صعب امر ہے اور انجام اوس کا موقوف نہایت صبر اور تحمل اور محنت اور مشقت اور مصارف کثیرہ پر ہے (اگر پیچھے سے گھبرا کے نقدی قبول کر لینا منظور ہے تو ناحق اس امر کو آپ اختیار فرماتے ہین مجھے حکم ہو راقم یہیں بہت اچھا بند و بست سلطان عالم کے واسطے کروادیوے۔ اسپر ارشاد ہوا کہ مین بھیک مانگون گا اور دریوزہ گری کرون گا مگر زنہار اک حبہ نقدی مین نہیں قبول کرون گا۔ زنہار تم اس طرح گفتگو کبھی نہ کیجیو۔ غرض راقم معہ سارے قافلے کے اٹھارویں جون 1856ء کو بنگال نام جہاز پر سوار ہوا اور جہاز نے کلکتہ سے لنگر اوٹھایا۔ اب چونکہ وہی سب نالائق لوگ جو سلطنت کی ضبطی کے باعث ہوئے تھے سب بادشاہ کے ہمراہ تھے اور وہی درانداز یان اور سازشین اور جوڑ بندیاں بدستور تھین ملکۂ کشور کے ساتھ بعضے مفسد جن کی کرنیل سلیمن نے شکایتین لکھی اور وہ چھپ کے بلو بک مین ارباب پارلیمنٹ کے پاس پیش تھین کہ وجوہ ضبطی سلطنت مین ایک وجہ مفسدہ پردازی اون لوگون کی لکھی گئی تھی اون ایک سو چالیس آدمی کے زمرہ مین جو ہمارے ساتھ روانہ ہوئے شریک ہو گئے۔ بعضے لوگ جو لکھنو مین قدیم سے جعل ساز مشہور تھے اون کو اون مفسدون نے پیچھے بلا لیا کہ دوسرے جہاز پر سوار ہو کے اسکندریہ مین شامل ہو گئے اور بعضے خواجہ سرا اجلا اور بعضے دو دو پیسے کے آدمی تینون صاحبون کے ہمراہ گئے کہ وہی سب اون تینون سرکارون مین پیش پیش اور بااقتدار تھے چنانچہ بعد لندن مین پہونچنے کے کرنیل سیکس جو اوس عرصہ مین ایسٹ انڈیا کمپنی کے چیر مین تھے ایک دن وہ راقم سے کہنے لگے کہ مولوی صاحب ہم آپ کے بڑے شکر گزار ہیں کہ آپ ہمارے دعوون کے سب گواہ ہمراہ لیکے آئے ہیں پہلا فساد جو مرزا ولی عہد بہادر کے ہمراہیوں سے ہوا وہ یہ تھا کہ بعضے رقوم جواہرات گران بہا کے جو بادشاہ نے حضرت ملکۂ معظمہ کی نذر کے واسطے ہمراہ کیئے تھے وہ مرزا ولی عہد بہادر کے مفوض ہوئے تھے اور ایک خواجہ سرا حبشی اون کی طرف سے خزینہ دار تھا جب بندر سویس مین جہاز کا لنگان ہوا چونکہ وہ بڑا بھاری جہاز گھاٹ تک نہیں جا سکتا تھا اس واسطے ایک اور چھوٹے جہاز پر سب مال و اسباب لوتار کے گھاٹ پر لے جاتے تھے رستہ مین اون خواجہ سرا صاحب نے جو خزینہ دار ظاہر کیا کہ وہ رقوم جواہرات گران بہا جس کی قیمت واقعی مجھے معلوم نہیں تھی مگر میری تخمین مین دو تین لاکھ روپیہ سے زیادہ کے نہ تھے کم احتمال ہے او نھون نے بڑے جہاز سے چھوٹے جہاز پر آنے کے وقت اون کو ایک خاصدان میں رکھ کے اپنے ایک خدمتگار کی تحویل مین سپرد کیا تھا جو ڈیڑھ دو روپیہ مہینے کا اون کے پاس نوکر تھا اوس کے ہاتھ سے وہ خاصدان بحر زخار مین گر پڑا۔ اب اس قضیہ مین خوض کرنا چاہئے اول تو وہ

رقوم گران بہا صندوق سے نکال کے خاصدان مین بدون کسی سے صلاح مشورہ پوچھنے کے رکھ لینا۔ بعد اوس کے خزانہ دار صاحب خود اس چھوٹے سے خاصدان کے بوجھ کے کاہے کو متحمل ہوتے اپنے دو پیسے کے خدمتگار کو سپرد کر دیا اور اوس کو بھی اپنی آنکھ کے سامنے نہ رکھا اجازت دی جہاز پر جہان چاہے بیٹھے۔ غرض واقعی حقیقت اس معاملہ کی خدا کو معلوم ہے بعضے کہتے ہیں کہ وہ امر ابتدا سے بادشاہ کے محل کے بندوبست کے بموجب ظہور مین آیا اور وہ خاصدان اوس محل کے پاس داخل ہو گیا۔ یا کلکتہ سے وہ مال گیا ہی نہ تھا۔ الغیب عند اللہ۔"
("تاریخ انگلستان" از مولوی مسیح الدین علوی)

سر سید احمد خان 1869ء میں برطانیہ گئے۔ ان کے سفر کی یادگار "مسافرانِ لندن" ہے۔ یہ سفرنامہ ان کی اپنی مرتب کردہ کتابوں میں سے نہیں۔ یوں بھی یہ سفرنامہ نامکمل رہ گیا جسے پہلی بار مجلس ترقی ادب لاہور نے 1961ء میں شائع کیا۔ اس سفرنامے کے آخری ابواب سر سید احمد خان نے لندن میں قیام کے دوران 11 مارچ 1870ء میں لکھے اور اسی روز اپنی ان بکھری تحریروں کے لئے "سفرنامہ مسافرانِ لندن" نام تجویز کیا۔ "مسافرانِ لندن" کے ابتدائی ابواب خطوط کی صورت میں سائنٹفک سوسائٹی گزٹ علی گڑھ میں شائع ہوئے مگر پبلک کی مخالفت کے سبب یہ سلسلہ بند کرنا پڑا اور دیگر ابواب غیر مطبوعہ رہ گئے۔

سر سید نے 4 جون 1869ء کے لندن سے لکھے گئے ایک خط بنام نواب محسن الملک سید مہدی علی خان میں "مسافرانِ لندن" سے متعلق لکھا ہے۔

"............ میں برابر اپنے حالات لکھ کر بھیجتا رہتا ہوں۔ اخبار میں چھپنے دیجئے۔ بعد معاودت انشاء اللہ تعالیٰ نظر ثانی کر کر رسالہ سفر مرتب کر کر چھاپوں گا۔"

افسوس کہ انہیں نظر ثانی کا موقع نہیں ملا "مسافرانِ لندن" محمد اسمعیل پانی پتی نے مرتب کیا۔ نمونہ عبارت ملاحظہ ہو:

"ہماری مہربان لینڈ لیڈی نے ہمارے کاموں کے انجام کے لئے دو نوکریں رکھی ہیں' ایک کا نام این اسمتھ ہے اور دوسری کا الیزبتھ ماتھیوز' پچھلی تو نو عمر غریب لڑکی ہے' متفرق کام کرتی ہے۔ اور پہلی نہایت ہوشیار اور لائق پڑھی لکھی خوشخط باسلیقہ ہے' کتابیں پڑھ سکتی ہے' تمام ضروری مضمون لکھ سکتی ہے' اخبار پڑھ سکتی ہے اور اس سے خوشی حاصل کر سکتی ہے۔ اپنا متعلق کام اس خوبی سے انجام دیتی ہے کہ جیسے کوئی کل یا گھڑی بلا تفاوت با قاعدہ اپنا کام کرتی ہے۔"

اسی سفرنامہ سے دو اقتباسات اور ملاحظہ کیجئے:۔

"(10-7) میجر اسمتھ صاحب غازی پور کے اسٹڈ والے اور ان کی میم صاحبہ اور ان کی بیٹی ایڈا جو تین چار برس کی ہے اور بہت تماشے کی باتیں کرتی ہے اور ایک ہندوستانی آیا اور مسٹر ٹیلر جو افیم کے کام پر مرزا پور میں متعین ہیں' اسی جہاز میں ہیں اور اس سبب سے کہ ہم اور وہ ایک ملک سے آئے تھے اور بسبب غازی پور اور بنارس رہنے کے نام سے شناسائی تھی' ایک قسم کی دوستانہ صاحب سلامت ہو گئی اور ایڈا بہت آتی ہے اور تماشے کی باتیں کرتی ہے اور میم صاحبہ بھی نہایت مہربانی سے بات چیت اور صاحب سلامت کرتی ہیں۔

(11) حسین علی بوہرہ ساکن کھمبائت متعلق گجرات اسی جہاز میں ہیں' وہ بطریق تجارت جاتے ہیں' سویز جائیں گے اور وہاں سے جو اسٹیمر جدہ کو جاتا ہے جدہ جائیں گے۔ انہوں نے کہا میرا ارادہ مصر جانے کا بھی ہے اس لئے کہ وہاں سر مبارک حضرت امام حسین علیہ السلام کا مدفون ہے اور بڑی زیارت ہے' اس کی زیارت کروں گا۔ مالوہ اور دکن میں مسلمان بوہرے بہت کثرت سے ہیں سب تجارت کرتے ہیں اور اپنی قوم کی پرورش اور پرداخت کے عجیب عجیب قواعد مقرر کئے ہیں جس کی وجہ سے میں ان کو نہایت عمدہ قوم تصور کرتا ہوں۔ جس زمانے میں کہ میں اندور گیا تھا میں نے اس قوم کے حالات خوبی تحقیق کئے تھے' شیعہ مذہب ہیں مگر شیعہ اثنا عشری اخباری اور کے اصول مذہب سے ان کے اصول مذہب اکثر ہیں' بعض ائمہ علیہ السلام کو نہیں مانتے اور در حقیقت بجز حضرت امام حسین علیہ السلام کے اور کسی کو معصوم خیال نہیں کرتے 'کل حزب بمالدیھم فرحون'۔

اگرچہ اور بہت سے صاحبوں سے ملاقات اور صاحب سلامت ہوئی مگر جن سے فی الجملہ خصوصیت ہوئی انہیں کا ذکر کافی ہے۔ جہاز کے اس بڑے لمبے کمرے میں جہاں کھانا کھانے کے لئے میز لگی ہوئی ہے' یہ دستور ہے کہ جس قدر مسافر جہاز میں ہوتے ہیں ان سب کی گنجائش کے لائق کرسیاں اور نہایت عمدہ بنچیں لگاتے ہیں اور مسافروں کی تعداد کے موافق چھری کانٹے چمچے اور خالی رکابیاں میز پر چن دیتے ہیں۔ اس وقت مسافر اپنے اپنے نام کا ٹکٹ میز پر جہاں اس کو کھانا منظور ہو رکھ دیتا ہے۔ پس وہ جگہ اسی کی ہو گئی' جب تک کہ اس جہاز میں سفر ہے ہمیشہ وہ جگہ اس کے بیٹھنے کی ہے' کوئی دوسرا وہاں نہیں بیٹھتا یہاں تک کہ اگر کسی دن وہ شخص کھانے پر نہ آئے تو وہ جگہ خالی رہے گی' دوسرا کوئی وہاں نہیں بیٹھنے کا۔

جبکہ میز تیار ہوئی فی الفور ہم چاروں آدمی گئے۔ ایک عمدہ جگہ دیکھ کر ہم چاروں نے چار نشست برابر کی لے کر اپنے اپنے نام کے ٹکٹ رکھ دیئے اور وہیں بیٹھا کئے۔

جہاز میں علی الصباح چائے اور توس کھانے کو ملتے ہیں، پھر آٹھ نو بجے حاضری کھاتے ہیں، پھر دو پہر کو ٹفن ہوتا ہے، پھر چار بجے کھانا کھلایا جاتا ہے، پھر رات کو چائے اور توس ملتے ہیں، کھانے کے وقت ہر قسم کے میوے تر و خشک موجود ہوتے ہیں۔ جس طرح انگریزوں میں دستور ہے اسی طرح کھانا کھایا جاتا ہے۔ باورچی اور جانور ذبح یا صاف کرنے والا انگریز ہے۔ تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ جو بڑے جانور ہیں اور جن میں خون زیادہ ہے جیسے بھیڑ بکری مینڈھا وغیرہ اس کو وہ ہمیشہ گردن کی شہ رگ میں آر پار چھری مار کر ذبح کرتے ہیں کیونکہ ان کے ہاں بھی دم مسفوح ناجائز اور حرام ہے یا اس کے اخراج کا رواج ہے اور پرند جانوروں کی نسبت وہ یہ کہتے ہیں کہ ان میں وہ خون جو چوپاؤں میں ہے اور جو دم مسفوح کہلاتا ہے، نہیں ہے اور ان کی مثال دریائی جانوروں کی سی ہے۔ پس ان کا ذبحہ صرف ان کا مار ڈالنا ہے' اس لئے پرند جانوروں کو ذبح نہیں کرتے' صرف گردن توڑ کر مار ڈالتے ہیں۔ مگر چونکہ میرے نزدیک عیسائیوں کا اس طرح پر پرند جانوروں کو مارا ہوا جو ان کے نزدیک ان جانوروں کا اسی طرح پر ذبحہ ہے جیسے کہ ہمارے نزدیک مچھلی اور ٹڈی کا ہے' بموجب مسئلہ شریعت حقہ محمدیہ کے مسلمانوں کو کھانا درست ہے' اس لئے میں نے اور ہمارے ساتھیوں نے ان دونوں قسم کے گوشتوں کے کھانے میں کچھ تامل نہیں کیا اور خوب مزے دار گوشت مٹن اور بیف اور مرغ و کبوتر کے کھائے۔ **الحمد لله الذی جعل دیننا یسر اولا عسر او الصلوة والسلام علی صاحب الشریعة السهلة الهدی.**

پہلی دفعہ جب ہم کھانے پر گئے تو ہمارے سامنے بھی برانڈی اور شیرے اور لال شراب پینے کے خالی گلاس بہ ترتیب لگائے ہوئے تھے۔ جب ہم وہاں جا کر بیٹھے ہم نے ان گلاسوں کو جن کو شراب پینے کا سمجھا پرے ہٹا کر اور اوندھا کر کے رکھ دیا۔ ایک قسم کی شراب ہے' وہ ویسے ہی گلاس میں پی جاتی ہے۔ جیسا کہ پانی پینے کا گلاس ہوتا ہے۔ وہ گلاس پانی پینے کو ہم نے اپنے اپنے پاس رہنے دیا تھا۔ (اسٹورڈ) یعنی خدمتگار جو یورپین تھا یہ سمجھا کہ یہ لوگ اسی قسم کی شراب پئیں گے جو اس گلاس میں پی جاتی ہے' وہ فی الفور بوتل اسی قسم کی شراب کی لایا اور مجھ کو اس نے سب میں بڑا لمبی سفید ڈاڑھی والا دیکھ کر سب سے پہلے میرے گلاس میں ڈالی۔ میں نے کہا "نو' نو' نو"۔ اس نے اسی وقت ہاتھ روکا اور چند قسم کی شرابوں کے نام لینے لگا اس مطلب سے کہ وہ شراب لے آوٴں' فلاں قسم کی شراب لاؤں۔ میں نے کہا "نو نو۔ لو نلی کولڈ واٹر"۔ اس وقت وہ گلاس اٹھا لے گیا۔ اور دوسرا صاف گلاس اور برف کا پانی جو خدا کی بنائی ہوئی زندگی بخش شراب ہے ہم سب کے آگے رکھ گیا۔ اس کے بعد کبھی ہمارے سامنے

شراب نہیں لایا اور سور کا گوشت شاید مانگنے پر دیا جاتا ہے کیونکہ کبھی کوئی ہمارے سامنے نہ لایا۔

جہاز پر ہم بہت خوشی خوشی سوار ہوئے اور سمندر کی فضا اور پانی پر کی سیلی سیلی ہوا گرمی کے موسم میں نہایت اچھی اور خوشگوار معلوم ہوتی تھی۔ شام کے وقت جب ہم کھانے پر گئے اور کچھ تھوڑا سا کھایا تھا کہ جہاز کی حرکت سے جو تھوڑا تھوڑا کروٹ کے بل ہلتا تھا' سر کا بھیجا ہلتا ہوا معلوم ہوا۔ جس کروٹ جہاز جھکتا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سر میں اس طرف کوئی نہایت بوجھل اور بھاری چیز آپڑی اور دوسری طرف سے سر خالی ہو گیا اور جب دوسری طرف جہاز کروٹ لیتا تھا تو اس وقت تمام بوجھ سر کا اس طرف جا پڑتا تھا۔ اور ادھر سے سر خالی ہو جاتا تھا اور چونکہ یہ حرکت جہاز کی بہت جلد جلد ہوتی تھی اس لئے سر میں بھی یہ کیفیت بہت سریع پیدا ہوتی تھی۔ ہم گھبرا گئے اور کھانے پر سے اٹھ کر جہاز کی چھت پر چلے گئے' ذرا ٹہلے' کسی قدر یہ کیفیت کم ہوئی۔ پھر سونے کا وقت ہوا' سو رہے' صبح کو اٹھے۔ میں نے خوبی نماز پڑھی اور کچھ تغیر مزاج نہیں پایا۔ خداداد بیگ نے بھی کہا کہ مجھے تو کچھ نہیں معلوم ہوتا۔ محمود کچھ گم سم تھا اور لیٹا جاتا تھا۔ حامد کو زیادہ تغیر تھا کہ اس کا سر بھاری تھا اور جی متلاتا تھا اور منہ میں پانی بھر آتا تھا۔ دوپہر کے قریب میری طبیعت زیادہ بگڑ گئی اور سر میں ایسی حرکت تھی کہ مطلق اٹھا اور کھڑا ہوا نہیں جاتا تھا۔ محمود کی اگرچہ یہ کیفیت نہ تھی مگر دن رات بچھونے پر پڑا رہتا تھا۔ حامد کا سب سے زیادہ برا حال ہوا۔ اس سے اندر آیا نہیں جاتا تھا' چار دن رات وہ جہاز کی چھت پر پڑا رہا اور مطلق کچھ نہیں کھایا' کھانے کے نام سے اور اس کی بو سے نفرت ہوتی تھی اور ابکائی آتی تھی۔ بہر حال ڈیڑھ دن اور ایک رات میری طبیعت پر تغیر رہا پھر میں اچھا ہو گیا۔ اب تک خداداد بیگ ہم سب میں ٹانٹے اور خوش ہیں۔ اگرچہ ان کو بھی کسی قدر تغیر ہوا۔ چھجو بھی اور سب کی نسبت اچھا ہے' شاید وہ قے کر آیا تھا۔

جہاز کے ایک افسر نے محمود کا یہ حال دیکھ کر کہا کہ میں ڈاکٹر کے پاس سے ابھی دوا لاتا ہوں اور خود جا کر گلاس میں دوا بنوا کر اپنے ہاتھ میں لایا اور یہ بھی کہا کہ اس میں تھوڑی سی اسپرٹ ہے۔ وہ شراب نہیں ہے۔ اس کو کوئی پیتا نہیں ہے' دواؤں میں کام آتی ہے۔ محمود نے ان کا بہت شکریہ کہا اور کہا کہ مجھے افسوس ہے کہ آپ کو تکلیف ہوئی مگر میں اسپرٹ ہونے کے سبب نہیں پی سکتا۔ اول تو اس بے چارے نے بہت سمجھایا۔ جب محمود نے نہ مانا تو اس نے کہا کہ میں پھر جاتا ہوں اور کہتا ہوں کہ ایسی دوا دو جس میں کسی قسم کی اسپرٹ نہ ہو۔ چنانچہ وہ

بے چارہ مہربان بغیر اسپرٹ کے دوا بنوا کر لایا' محمود کو پلائی اور درحقیقت اس نے بہت فائدہ کیا۔"

("مسافرانِ لندن" از سر سید احمد خان)

(2)

"یہ ایک غمگین واقعہ ہمارے جہاز میں ہوا۔ (کپتان وچ) ایک اور جہاز کے کپتان تھے جو بمبئی کے کنارے پر کھڑا تھا' وہ بشدت بیمار ہو گئے تھے۔ ان کے دوستوں نے یہ کوشش کی کہ کسی طرح ولایت پہنچایا جائے' اس لئے انہیں اس جہاز پر لائے۔ وہ بےہوش تھے اور رات بھر جینے کی بھی کچھ توقع نہ تھی۔ چنانچہ گیارہویں تاریخ رات کے وقت وہ مر گئے۔ ان کو دوپہر کے بعد ان کا جنازہ ایک تختہ پر بنا کر لائے اور ان پر جہاز کا نشان یعنی پھریرا ڈال دیا تھا اور شاید دونوں پاؤں میں لوہے کے دو گولے باندھ دیئے تھے۔ اس تختے کو جہاز کے کنارے پر رکھا اور پادری صاحب نے جو جہاز میں تھے نماز پڑھی اور تختے کو کھڑا کیا اور وہ لاش پاؤں کے بل سمندر میں کود پڑی اور سب کی نگاہوں سے غائب ہو گئی۔ میرے دل پر اس بے کسی کی موت کا اور اس طرح پر جنازہ بنا کر لانے کا اور سمندر میں ڈال دینے کا ایک عجیب اثر پیدا ہوا اور فی الفور یہ شعر میرے دل میں گذرا۔

چو آہنگ رفتن کند جان پاک
چہ بر تخت مردن چہ بر روئے خاک

جب آدمی مر گیا تو پھر جو چاہو سو کرو۔ آگ میں جلاؤ' پانی میں ڈالو' خاک میں دباؤ' جو ہونا تھا وہ ہو چکا اور جو ہونا ہے وہ ہو گا۔

ہم کو بمبئی سے عدن پہنچنے تک کئی ایک بغلے اور بادبانی جہاز اور اسٹیمر بمبئی کو جاتے ہوئے ملے مگر ایک ایک میل دو دو میل کے فاصلے پر تھے۔ صرف دو بادبانی جہاز جن کا ذکر آگے آتا ہے بہت قریب ہمارے جہاز کے ملے تھے۔ جب کوئی جہاز دن کو دکھلائی دیتا ہے تو فی الفور پھریرا نشان کا بلند کیا جاتا ہے اور چونکہ ہر ایک قوم کے جہازوں کے پھریرے علیحدہ علیحدہ رنگ کے ہیں اس لئے معلوم ہو جاتا ہے کہ کس کا جہاز ہے۔

رات کے وقت ایک دخانی جہاز ملا' کپتان نے فی الفور دو مہتابیاں جن میں ایک قسم کی آتش بازی تھی منگائی۔ غالباً میری یاد اور میرا خیال صحیح ہے کہ اول مہتابی میں سرخی مائل روشنی نکلی' تھوڑی دیر بعد چھچھوندر کی طرح اس میں سے کچھ چھوٹا اور پٹاخے کی سی آواز ہوئی

اور پھر سفید رنگ کی مہتابی چھوٹی۔ اس کے بعد دوسری مہتابی کو جلایا تو اس میں نیلے رنگ کی مہتابی چند منٹ تک چھوٹتی رہی۔"

("مسافرانِ لندن" از سر سید احمد خان)

"سید احمد خان کا سفر نامۂ پنجاب" سر سید کے سفر سے متعلق دوسری کتاب ہے۔ یہ کتاب سر سید کے سفر پنجاب 1884ء کا احاطہ کرتی ہے جو سر سید کے رفیق خاص مولوی سید اقبال علی نے لکھی اور جسے شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی نے مرتب کیا ہے۔

سر سید کا یہ سفر لدھیانہ' جالندھر' امرتسر' گورداسپور' لاہور اور پٹیالہ تک کا تھا۔ مولوی سید اقبال علی نے اس سفر کی روداد اور رپورتاژ کے انداز میں لکھی ہے۔ پروفیسر حمید احمد خان لکھتے ہیں :

"سید احمد خان کا سفر نامہ پنجاب" محض ایک سفر نامہ نہیں ہے بلکہ یہ 1857ء کی تباہی کے بعد مسلمانان بر اعظم کی جہد لبقا کی داستان کا ایک اہم باب ہے۔"

اس کتاب کا اولین ایڈیشن علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس سے 1884ء میں شائع ہوا۔ دوسرا اور تیسرا ایڈیشن مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی' بالترتیب مجلسِ ترقی ادب لاہور نے اکتوبر 1973ء اور ایجوکیشنل پبلک ہاؤس دہلی نے 1980ء میں شائع کیے ہیں۔

"سید احمد خان کا سفر نامہ پنجاب" سے ایک اقتباس دیکھتے چلئے :۔

"لاہور کے اسٹیشن پر ہم کو ایسا سامان دکھائی دیا جیسا کہ الف لیلہ کے قصوں میں بیان ہوا ہے۔ کل اسٹیشن لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اسٹیشن پر لال بانات کا فرش بچھایا گیا تھا۔ اس کے دونوں طرف دو قطاریں ایسے لوگوں کی تھیں جو ترکی ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔ مجلسِ اسلامیہ لاہور کی جانب سے انگریزی و اردو میں ایک پروگرام سید صاحب کی تشریف آوری کا اور ان کاموں کا' جو زمانہ قیام میں ہونے والے تھے' چھاپہ ہو کر تقسیم ہو گیا تھا۔ اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ سید صاحب مہاراجہ کپورتھلہ کی کوٹھی میں فروکش ہوں گے اور ان کی سواری ریل کے اسٹیشن سے لنڈا بازار ہو کر شہر کی گول سڑک سے گزر کر براہ انارکلی فرودگاہ پر جاوے گی۔

جب ریل اسٹیشن پر پہنچی تو لوگوں نے چیرز دی۔ سید صاحب جب پلیٹ فارم پر اترے تو خان بہادر محمد برکت علی خاں صاحب نے سید صاحب اور ان کے ساتھیوں کو پھولوں کے گلدستے دیے اور بتوسط خان بہادر ممدوح نواب عبدالمجید خاں صاحب بہادر' سردار دیال سنگھ صاحب بہادر مجیٹھہ' دیوان پنڈت ہرندرناتھ صاحب' خان بہادر ڈاکٹر رحیم

خان صاحب' پیرزادہ مولوی محمد حسین صاحب ایم۔ اے' شیخ سندھے خان صاحب آنریری مجسٹریٹ' سید رمضان صاحب' مولوی سید ممتاز علی صاحب اور ڈاکٹر امیر شاہ صاحب سے ملاقات ہوئی۔

جناب مسٹر پارکر صاحب جوڈیشل اسسٹنٹ کمشنر و رجسٹرار پنجاب یونیورسٹی پنجاب بھی ریلوے اسٹیشن پر سید صاحب سے ملنے تشریف لائے تھے۔ سید صاحب نے ان سے ملاقات کی اور ان کی اس عنایت اور تکلیف فرمائی کا شکریہ ادا کیا۔

ہجوم اس قدر کثرت سے تھا کہ ہر ایک صاحب سے ملنا اور شکریہ کرنا ممکن تھا' مگر جہاں تک ہو سکتا تھا سید صاحب دلی احسان مندی کے طریقے پر لوگوں سے ملتے اور مصافحہ کرتے تھے۔ لاہور کے "پنجابی اخبار" کے لائق ایڈیٹر نے اپنے اخبار مطبوعہ دوسری فروری میں لکھا ہے کہ "اس وقت (یعنی جب کہ سید صاحب اسٹیشن پر پہنچے) کثرتِ ہجوم اور لوگوں کے دلی جوش اور شوق کا' جو ان کے دلوں میں سید صاحب کے دیدار کا تھا' یہ عالم تھا کہ ہر ایک یہی کوشش کرتا تھا کہ اس نعمت سے محروم نہ جائیے' چنانچہ لوگوں کے اس اشتیاق نے اکثر معزز حاضرین کو سید صاحب سے مصافحہ کرنے سے محروم رکھا......اس وقت لوگوں کی بشاشت کا حال قابل دید تھا اور مسلمانوں کے آئندہ اقبال کی فال نیک ظاہر کرتا تھا۔ پلیٹ فارم پر کافی تعداد کے وہ اصحاب بھی موجود تھے جنہوں نے اپنے لباس میں زمانۂ حال کے موافق ترقی کی ہے اور مسلمانوں کے مرغوب لباس ترکی کو اختیار کر لیا ہے۔ یہ گروہ سید صاحب کا خاص باڈی گارڈ کے طور پر تھا۔"

("سید احمد خان کا سفرنامہ پنجاب" از مولوی سید اقبال علی)

سر سید احمد خان کے "مسافرانِ لندن" کے بعد اردو کا ایک لاجواب سفرنامہ "اودھ اخبار" لکھنو میں سامنے آیا۔ جس کا مصنف اردو' عربی اور فارسی کا جید عالم ایڈورڈ ہنری پامر تھا۔ ایڈورڈ ہنری پامر (پ1840ء) السنہ شرقیہ سے دلچسپی رکھنے والی نمایاں ہستیوں میں سے ایک تھے۔ ان کی پیدائش کیمبرج' لندن میں ہوئی۔ 1863ء میں پامر' کیمبرج کے سینٹ جانس کالج میں داخل ہوئے اور 1867ء میں اپنی اردو اور فارسی کی قابلیت کی وجہ سے اسی کالج کے فیلو منتخب ہوئے۔ 1870ء میں حکومتِ برطانیہ نے خصوصی اسکالر شپ دے کر "سنائی" بھیج دیا۔ جہاں ان کی عربی قابلیت میں اضافہ ہوا۔ 1871ء میں اپنے کالج واپس گئے اور عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ انہوں نے اسی زمانہ میں انگریزی فارسی لغت اور کئی چھوٹی بڑی کتابیں لکھیں۔ 1881ء میں قرآنِ مجید کا ترجمہ کیا۔ حکومت کی

طرف سے انہیں مصر بھیجا گیا جہاں سے واپسی پر عرب کے ایک ریگستانی علاقہ میں پامر اپنے متعدد ساتھیوں کے ساتھ قزاقوں کے ہاتھوں مارے گئے۔

"سفر نامۂ پامر" ایڈورڈ ہنری پامر کا ایک نایاب اردو سفر نامہ ہے جو "اودھ اخبار" لکھنو 1873ء میں قسط وار شائع ہوا۔ پامر بھی فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی کی طرح کبھی ہندوستان نہیں آئے لیکن ان کی عربی و فارسی کے علاوہ اردو دانی کی قابلیت کا اعتراف باوقار اہل قلم نے کیا ہے۔

پامر کے سفر نامے سے نمونۂ عبارت ملاحظہ ہو:

1- اٹالین اوپرا کے تماشے میں شاہ کا جانا۔

"تو کیا دیکھتے ہیں کہ سات سو پری زاد گل اندام' مہر چہرہ' زہرہ جبیں' ماہ تابان و خورشیدِ درخشاں پہ شیدا ہیں' ہر ایک پر بہائے زمرد اور مروارید اور الماس کے لگائے ہوئی تھی' ضیائے گیس میں ایسا ہوتا تھا کہ ہزاروں ماہتاب نکلے ہیں' جو جو راگ اور سوانگ اور کرتب اور تماشے دکھلائے کہ بادشاہ اور ہمراہی حیران ہو گئے۔ الٰہی یہ خواب ہے۔ یہ سچ مچ کے آدم زاد ہیں' یا پریوں کا اکھاڑا اترا ہے۔ خصوصاً جب پریاں تار کے زور سے مثل طائروں کے اڑتی تھیں' یکایک بادشاہ اور سب ہمراہی کی زبان سے "واہ واہ" کی صدا بلند ہوئی۔"

2- "اب ہر لحہ امیدواری دیدار فرحت آثار شہریار کامگاری تھی' کبھی خبر اڑتی تھی کہ اب شاہی ریل گاڑی قریب آن پہنچی۔

بسکہ در جانِ فگار م چشم بیدارم توی
ہر کہ پیدای شود از دور' پندارم تو ی

"باوجود گرمی اور انتظاری کے ایک طرح کی چہل اور زندہ دلی سبھوں کے دلوں پر چھا رہی تھی......"

محمد حسین آزاد نے دو سفر نامے یادگار چھوڑے۔ "وسط ایشیاء کی سیر" اور "سیر ایران"۔ آخر الذکر سفر نامہ "سیر ایران" محمد حسین آزاد کے سفر روس سے متعلق یادگار ہے۔ افسوس کہ محمد حسین آزاد کو زندگی نے اتنی مہلت نہ دی کہ وہ اپنے اس سفر نامہ کو خود رسالہ کی شکل میں مرتب کرتے۔ ان کی وفات کے بعد آغا محمد طاہر نبیرۂ آزاد نے ان کی بکھری بکھری یادداشتوں کو "سیر ایران" کے نام سے مرتب کیا۔

اس کتاب کی بنیاد محمد حسین آزاد کے روزنامچوں پر ہے جنہوں ایک خاص ترتیب دے دی گئی ہے۔ اس سفر کا آغاز برٹش حکومت کے طے کردہ ایک مخصوص سیاسی مقصد کے

تحت 23 ستمبر 1885ء میں ہوا۔ مولانا آزاد لاہور سے بذریعہ ریل کراچی روانہ ہوئے۔ جہاں دس روز کے مختصر قیام کے بعد 12 اکتوبر کو عربیا نامی بحری جہاز کے ذریعے ایران گئے اور اس کے بعد روس کی طرف نکل گئے اور 24 جولائی 1886ء میں لاہور واپسی ہوئی۔ یہ سفرنامہ انہوں نے عالمِ دیوانگی میں لکھا۔ دریاؤں کے ناموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ روس گئے تھے۔ نیز بہت سے داخلی شواہد اس دعویٰ کے ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ محمد حسین آزاد کے پاگل پن کا باعث ان کی جوان بیٹی کی وفات کے علاوہ انگریز سرکار سے اس خفیہ مشن کے بدلے میں نہ ملنے والا انعام بھی ہے۔ سفرنامے سے نمونہ تحریر ملاحظہ ہو:

"23 ستمبر 1885ء 12 ذوالحجہ 1302ھ یوم سہ شنبہ 6 بجے شام کو لاہور سے آتش فشاں اژدہے پر سوار ہر کر فرش خاک کو لپیٹا۔ دودن اور رات میں کراچی جا اترا۔ وہاں نہنگ دخانی پر بیٹھ کر سطح آب کو طے کیا اور دسویں دن بوشہر جا پہنچا۔ جہاز میں دورانِ سفر اور برہمی طبع کی طرف بڑا اندیشہ تھا کہ صفراوی مزاج ہوں۔ مگر شکر خدا کہ معلوم بھی نہ ہوا۔ بڑا سبب اس کا یہ ہے کہ شوق سفر اور سواری جہاز کے ذوق سے دل ایسا لبریز تھا کہ جب جہاز چند میل نکل گیا۔ تب یاد آیا کہ خلل ہائے مذکورہ کا اثر مجھ پر ہے یا نہیں؟ اس پر خیال کیا تو کچھ بھی نہ تھا۔"

("سیر ایران" از محمد حسین آزاد)

1888ء میں گوپی ناتھ کا سفرنامہ "سفرنامہ گوپی ناتھ" اور 1889ء میں نواب محمد عمر کا "فرہنگ فرنگ مع آہنگ فرنگ" شائع ہوا۔ ان دو سفرناموں کے علاوہ بھی نواب محمد عمر نے کئی سفرنامے لکھے جو ان کی پچاس سالہ سیاحت کی روداد سامنے لاتے ہیں۔ 1890ء میں نثار علی بیگ کا سفرنامہ "سیر یورپ" کے عنوان سے چھپا۔ یہ سفرنامہ روزنامچہ کے انداز میں تحریر کیا گیا تھا۔ جبکہ 91-1890 میں مرزا قاسم علی کا سفرنامہ "زادِ زائرین" شائع ہوا۔

1893ء میں نواب محمد عمر کا اسپین کا سفرنامہ "قند مغربی" کے عنوان سے اور نواب آف رام پور، محمد حامد علی خان کا سفرنامہ "مسیر حامدی" سامنے آئے۔

مولانا شبلی نعمانی کا "سفرنامہ روم، مصر و شام" پہلی بار 1894ء میں شائع ہوا۔ اس خالصتاً علمی نوعیت کے سفرنامے کا آغاز 26 اپریل 1892 کو علی گڑھ سے قسطنطنیہ کے سفر کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس سفر کے دوران عرب دنیا کے کتب خانوں اور درس گاہوں کی سیر کے ساتھ ساتھ علماء سے ملاقاتوں کے سلسلے قابلِ مطالعہ ہیں خصوصاً شیخ عبد الفتاح اور شیخ علی ظبیان جیسی اہم شخصیتوں سے ان کی ملاقاتوں کی روداد دل پذیر ہے۔

شبلی نعمانی بیروت اور قاہرہ سے ہوتے ہوئے وطن پلٹے۔ اس دوران میں انہوں نے عرب اسلامی دنیا کے عجائب خانوں' اخبار کے دفاتر اور مختلف النوع انجمنوں کا گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ نمونہ تحریر ملاحظہ ہوا:

"20 مئی کی صبح کے وقت ازمیر پہنچے۔ چونکہ یہ ایک بہت بڑی بندرگاہ ہے جہاز دو روز تک یہاں مقیم رہا۔ میں اپنے شامی دوستوں کے ساتھ جہاز سے اترا۔ کنارہ پر وہی تذکرہ (پروانہ راہداری) کی باز پرس تھی۔ لیکن ساتھیوں کی بدولت مجھ کو چنداں زحمت نہ ہوئی۔ یہ شہر جس کو انگریزی میں سمرنا کہتے ہیں۔ ایشیائے کوچک کا صدر مقام ہے۔ اور اس صوبہ میں اس سے زیادہ وسیع اور آباد شہر کوئی نہیں ہے۔ قدامت اور واقعات کے لحاظ سے بھی ایک یادگار مقام ہے۔ ہومر' جو یونان کا مشہور شاعر گزرا ہے اور جس کی نسبت یورپ کا خیال ہے کہ دنیا کا سب سے بڑا شاعر تھا' اس کی قبر یہیں ہے۔"

ایک اقتباس اور دیکھئے:

"17 مئی کو جہاز ساپرس پہنچا۔ یہ ایک مختصر سا جزیرہ ہے جو بحر روم میں واقع ہے اور جس کو عربی میں قبرص کہتے ہیں۔ یہ جزیرہ اسلام کی قدیم فتوحات کی یادگار ہے۔ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں 27ھ میں امیر معاویہ نے اس پر حملہ کیا۔ شہر والوں نے اس پر صلح کی کہ جس طرح ہم سلطنت روم کو خراج دیتے ہیں تم کو بھی سات ہزار دو سو دینار سالانہ دیا کریں گے اور تم میں اور رومیوں میں کبھی جنگ ہوگی تو ہم کو کسی سے واسطہ نہ ہوگا۔ امیر معاویہ نے یہ شرط قبول کر لی۔ لیکن 32ھ میں ان لوگوں نے خلافِ عہد مسلمانوں کے مقابلہ میں رومیوں کو مدد دی۔ امیر موصوف نے پانسو کشتیوں کے بیڑے کے ساتھ دوبارہ چڑھائی کی۔ اور نہایت آسانی سے فتح کر لیا۔ تاہم تعداد خراج اور صلح کی شرطیں وہی رہنے دی۔ ان کے حکم سے بارہ ہزار عرب وہاں جا کر آباد ہو گئے اور مکانات اور مسجدیں تعمیر کیں۔ ایک مدت کے بعد یہ جزیرہ مسلمانوں کے ہاتھ سے جاتا رہا۔ اور کئی بار فتح ہو ہو کر پھر نکل گیا۔ سب سے اخیر ترکوں نے 1570ء میں عیسائیوں سے واپس لیا۔ اور اب تک انہی کے قبضہ میں تھا۔ روم و روس کی اخیر جنگ میں انگریزوں نے اس شرط پر لیا کہ سالانہ خراج جو سلطان کو ملتا تھا اب بھی ملتا رہے گا چنانچہ وہاں انگریزی حکومت اور انگریزی انتظام ہے۔

اس جزیرہ میں لرنکا اور لماسون دو بڑے شہر ہیں اور دونوں جگہ جہاز تھوڑی دیر کے لئے لنگر کرتا ہے۔ میں نے لماسون کی سیر کی۔ چونکہ انگریزی حکومت ہے۔ اس لئے راہداری کے پروانہ کی پرسش وجود نہ تھی' میں داخل ہوا تو میرے سر پر ایرانی ٹوپی اور بدن پر

شیروانی اچکن تھی۔ غالباً لوگوں نے یہ وضع کبھی دیکھی نہ تھی۔ میں جدھر سے گذرتا لوگ تعجب سے دیکھتے اور کہیں کھڑا ہو جاتا تو تماشائیوں کی بھیڑ لگ جاتی۔ سب سے پہلے میں جامع مسجد گیا۔ مسجد کے متصل ایک مکتب ہے وہاں ایک مولوی صاحب جو نہایت باوقار اور خوش لباس تھے ابتدائی صفوں کو درس دے رہے تھے۔ میں نے سلام علیک کی' وہ کھڑے ہو گئے اور نہایت مہربانی سے سلام کا جواب دے کر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ لڑکے تپائیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں بھی ان کے برابر بیٹھ گیا۔ مولوی صاحب کے اشارہ سے ایک لڑکے نے قرآن مجید کی چند آئتیں پڑھیں میرے دل پر عجیب اثر ہوا۔ خیال آتا کہ کہاں وہ حجاز کا ریگستان کہاں بحر روم کے دور دراز جزیرے۔ اس مقدس کلام (قرآن) میں کیا تاثیر تھی کہ مشرق سے مغرب تک برق قوت بن کر دوڑ گئی۔ اور آج تک باقی ہے۔ وہ معصوم لڑکا خوش لحن بھی تھا۔ اور اصول قرأت کے مطابق پڑھتا تھا۔ اتفاق سے آئتیں بھی موثر تھیں ان باتوں نے مجھ کو بالکل مدہوش کر دیا اور دیر تک ایک عجیب حالت طاری رہی۔"

("سفرنامہ روم' مصر و شام" از شبلی نعمانی)

اوائل 20ویں صدی عیسوی تک کے دیگر سفرناموں میں مندرجہ ذیل نمایاں تر ہیں۔ یہ سفرنامے مختلف علاقوں اور تہذیبوں سے متعلق اہم معلومات فراہم کرتے ہیں :

1-"فسانہ برطانیہ"	ن۔ن	مطبوعہ الناظر پریس لکھنؤ س۔ن
2-"تدریخ طرز حیات ہندو انگلینڈ"	از شیخ محمد تراب علی	
3-"تدریخ طرز معاشرت ہندو انگلینڈ"	از مولوی احسان اللہ	مطبوعہ پریس علی گڑھ کالج علیگڑھ س۔ن
4-"پیر پہاڑا" سفرنامہ کھٹمنڈو	از سید سخاوت علی	طبع اول 1896ء (یہ سفرنامہ ڈرامے کے انداز میں لکھا گیا)
5-"سیر پنجاب"	از سرکشن پرشاد	طبع اول 1897ء (اردو کا پہلا منظوم سفرنامہ)
6-"انگلینڈ اور انڈیا"	از لالہ بیج ناتھ	طبع اول 1897ء
7-"فسانہ برطانیہ"	از گنگا پرشاد طپش	مطبوعہ: نول کشور لکھنؤ (ص480)
8-"سیر بن مرقع چین"	از حافظ مولوی عبدالمجید خان	مطبوعہ: حیدرآباد دکن
9-"اہرام مصر"	از حکیم محمد علی	مطبوعہ الناظر پریس چوک لکھنؤ
10-"بلاد اسلامیہ"	از حافظ عبدالرحمن امرتسری	مطبوعہ 1898ء

11- "سفر نامہ یورپ و بلاد روم از مولوی محبوب عالم شام"	ایڈیٹر پیسہ اخبار لاہور	مطبوعہ 1900ء لاہور
12- "سیاحتِ فتح خانی"	از نواب فتح علی خان قزلباش	مطبوعہ :1902ء لاہور
13- "سفر نامہ بغداد"	از مولوی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار' لاہور	مطبوعہ :1904ء لاہور
14- "حالات برما"	از حفیظ اللہ	مطبوعہ لگ بھگ 1898ء
15- "سفر نامہ ملایا"	از عبد الغفور	مطبوعہ لگ بھگ 1898ء
16- "سیر برما"	از مولوی عبد الخالق	مطبوعہ لگ بھگ 1899ء
17- "عجائبات یورپ"	از منشی محبوب عالم	تکمیل 1908-1900ء
18- "خوفناک دنیا"	از محمد علی سبزواری	مطبوعہ 1901ء (یہ شمالی افریقہ کا سفر نامہ ہے)
19- "سفر کشمیر"	از محمد دین فوق	مطبوعہ 1907ء

اردو کی پہلی سفر نامہ نگار خاتون

نازلی رفیعہ سلطان کا سفر نامہ "سیر یورپ" 1908 میں شائع ہوا۔ یہ سفر نامہ سفر یورپ کے دوران ہندوستان میں قیام پذیر بزرگوں کو لکھے گئے خطوط پر مشتمل ہے۔ جبکہ اس سفر نامے کی دوسری نمایاں پہچان نسوانی انداز تحریر ہے۔ "سیر یورپ" میں ایک مشرقی عورت کی نظر سے یورپی تہذیب کا مشاہدہ جداگانہ لطف کا حامل ہے۔

اردو کی دوسری سفر نامہ نگار خاتون

بیگم سر بلند جنگ بہادر کا سفر نامہ دنیا عورت کی نظر میں 1910ء میں سامنے آیا۔ اس سفر نامے کے عنوان سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں مشرقی عورت یورپ کے تہذیبی مطالعے کو کس قدر اہمیت دے رہی تھی۔ یوں 20 ویں صدی عیسوی کے نصف اول کی ابتداء خواتین کے سفر ناموں میں یورپ کی جانب نظر اٹھا کر دیکھنے سے ہوئی اور اسے بھی ایک اتفاق کہہ لیں کہ اردو کی تیسری سفر نامہ نگار خاتون سلطان جہاں بیگم (سیاحت سلطانی) نے سفر نامۂ حجاز 1911ء قلم بند کیا اور یوں معلومہ دنیا تک رسائی کے جتن میں ہماری خواتین مرد حضرات سے پیچھے دکھائی نہیں دیتیں۔

1911ء میں مظہر علی کا سفر نامہ "نادر روزنامچہ" ڈائری کے انداز میں سامنے آیا اور اسی سال خواجہ غلام الثقلین کا سفر نامہ "سیاحت نامہ" 1329ھ مطابق 1911ء میں شائع ہوا' جسے اردو نثر کے ارتقاء میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ نمونہ' عبارت ملاحظہ ہو :

"میرا تجربہ بمبئی کا اور جہاز کا یہ ہے کہ گورا' بمبئی اور گجرات کے لوگ لہجے میں عموماً اکھڑ ہیں' اور ہمارے خیال میں بے تہذیبی سے آدمی کو مخاطب کرتے ہیں' مگر شاید ان کی نیت یہ نہ ہو کہ سختی سے گفتگو کریں' ممکن ہے کہ کرخت لہجہ اہل عرب سے انہوں نے لیا ہو' اس صوبے میں ایک عیب تو اچھے پڑھے لکھے لوگوں سے لے کر عوام تک میں ہے کہ ان کے نزدیک کسی شخص سے کوئی غلطی ہو جائے تو بغیر ٹوکے نہ رہیں گے' تحمل و ملائمت نہیں جانتے مگر ان کی نیت غالباً بری نہیں ہوتی۔ تربیت کی کمی اس کا باعث ہے۔

ایک نئی بات جہاز پر دیکھی' یعنی ان لوگوں (مسیحی مشنری) نے ایک نابینا عیسائی عرب دکھایا جس نے بغداد میں اندھوں کے مدرسے میں معلمی کی ہے۔ یہ شخص لکھتا ہے اور پڑھتا بھی ہے' ایک فرانسیسی نے اس کو نوشت و خواند کی تعلیم دی ہے اور ایک سوئی سے ہر آواز پر کچھ نقطے بناتا ہے اور پھر انگلی سے مس کر کے ان کو پڑھتا ہے' چناں چہ میں نے یہ عبارت بتائی' خواجہ غلام الثقلین ساکن پانی پت از مضافاتِ دہلی' ملک ہندوستان' اس نے اپنے نقطوں میں عبارت لکھی پھر انہیں نقطوں میں مگر کسی قدر بدلے ہوئے تلفظ میں اس کو پڑھ دیا۔ یہ طریقہ اٹھارہویں صدی کے آخر میں ایک فرانسیسی پادری نے نکالا تھا۔

یہ بے چارہ انقلابِ فرانس 1793ء میں قتل ہوا' وہ گونگوں اور بہروں کو بھی اسی طرح تعلیم دیتا تھا' پادریوں نے بغداد میں اندھوں کا سکول کھولا ہے جس میں چالیس پچاس طالب علم بیان کئے جاتے ہیں۔

شط العرب کا پانی شیریں اور اچھا ہے اور اگر آب پاشی با قاعدہ ہو تو کچھ شک نہیں کہ یہیں ایران وترکی ہر دو کی آمدنی ایک ایک کروڑ روپیہ ہو سکتی ہے۔ بشر طیکہ کہ امن کامل ہو اور آبادی کو ترقی دی جائے۔ یہ آمدنی چار پانچ سال کے اندر بڑھ سکتی ہے۔ یہاں کھجوریں نہایت کثرت سے ہیں اور ان کی تجارت زور پر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سب سے عمدہ کھجوریں یورپ کو چلی جاتیں ہیں۔"

("سیاحت نامہ" از خواجہ غلام الثقلین)

مولوی محمد علی قصوری 1911ء میں حصولِ علم کی خاطر انگلستان گئے اور 1914ء میں کیمبرج یونیورسٹی سے ایم۔ اے ریاضی کر کے وطن لوٹے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزوں

نے روس کی حمایت حاصل کر کے افغانستان پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ مولوی محمد علی قصوری نے مولانا عبید اللہ سندھی، حکیم اجمل خان اور مولانا ابوالکلام آزاد کے مشورے پر افغانستان کا سفر اختیار کیا تاکہ وہاں کی حکومت کو برطانیہ کے منصوبے سے آگاہ کرتے ہوئے انہیں ہندوستان پر حملہ کرنے کی ترغیب دیں۔

اس مقصد کے حصول کی خاطر مولوی محمد علی قصوری کئی برس تک کابل میں رہے۔ جہاں سے واپسی پر ان کا سفرنامہ "مشاہدات کابل و یاغستان" 1918ء میں شائع ہوا۔ بے شک یہ سفر سیاسی اغراض کے تحت کیا گیا لیکن اس سے ہوا یہ کہ معاصر معاشرت اور تاریخ کی چھان پھٹک کے طفیل عصری شعور کے در باز ہوئے۔ سفرنامے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

"کالج کا سائنس ڈیپارٹمنٹ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کیونکہ جب میں نے اس کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ ایک لاکھ سے زائد روپیہ اس پر خرچ ہو چکا ہے۔ لیکن اس کی حالت ایک ادنیٰ سکول کے دارالتجربہ سے بہتر نہ تھی۔ مجھے وہاں جا کر پہلی دفعہ احساس ہوا کہ مسلمان حکومتوں میں مسلمان عہدہ دار بہ استثناء چند کس درجہ خود غرض اور خائن واقع ہوئے ہیں۔ ہم نے ترکی اور ایران کے متعلق پڑھا تھا اور افغانستان میں جا کر بہ چشم خود دیکھ لیا۔ مثال کے طور پر ایک معمولی فریکشن مشین (جس سے رگڑ کے ذریعہ بجلی پیدا کی جاتی ہے) کے لئے افغان حکومت کو گیارہ سو روپے ادا کرنا پڑا تھا۔ حالانکہ اس کی قیمت اس وقت پندرہ روپے سے زیادہ نہ تھی۔ یہی حالت کتب خانہ کی تھی۔ معمولی معمولی ناولوں کی قیمت بیس بیس پچیس پچیس روپیہ لگائی گئی تھی۔ غرض مجھے اس امر کا پختہ یقین ہو تا گیا کہ اسلامی حکومتیں اپنے عمال کی رشوت ستانی کا شکار ہو رہی ہیں۔ ایک اور معمولی سا واقعہ پیش کرتا ہوں میں نے نظارۃ المعارف میں اسکول کی عمارت کی توسیع کی تجویز پیش کی اور دو کمروں کے اضافہ کی منظوری لی۔ اتفاق سے معین السلطنت صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ ان دو کمروں کی لاگت کیا ہو گی۔ میں نے عرض کیا کہ بمشکل تین ہزار روپیہ۔ خیر وہ تجویز منظور ہو کر محکمہ تعمیر میں گئی۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہوں نے ستاسی ہزار کا تخمینہ بنا کر بغرض سفارش میرے پاس بھجوا دیا۔ جب معاملہ نظارۃ المعارف میں پیش ہوا تو مجھے اپنے تخمینہ کی صحت پر اصرار تھا اور ارکان مجلس کو سرکاری تخمینہ پر۔ آخر معین السلطنت صاحب نے مجھ کو حکم دیا کہ تم بنوا دو ورنہ تمہارے خلاف انضباطی کارروائی کی جائے گی۔ بھلا ایک پرنسپل کو اپنے تعلیمی مشاغل سے اتنی فرصت کہاں مل سکتی تھی کہ وہ اپنی نگرانی میں دو کمرے تعمیر کرائے۔ لیکن کابل میں سب کچھ ممکن تھا۔ چنانچہ میں نے وہ دونوں کمرے بنوائے اور ان کی لاگت صرف

تئیس سو (2300) روپیہ ہوئی۔ معین السلطنت صاحب کو اس قدر غصہ آیا کہ انہوں نے چیف انجینئر سے جو انگریز تھا جواب طلبی کی۔ یہ کابل کے مقیم انگریزی عملہ سے میری دشمنی کی ابتدا تھی۔"

"جب میں نے افغانستان کا قصد کیا تو میں اچھی طرح سے جانتا تھا کہ وہاں کا نظامِ حکومت شخصی یا استبدادی ہے۔ لیکن میرا خیال تھا کہ بہر حال افغانستان ایک منظم سلطنت ہو گی چنانچہ اپنے افغانستان دوستوں سے کابل کے نظم و نسق کی داستانیں اور عدل شاہی کی حکائتیں سن کر میں یہ خیال کرتا تھا کہ افغان حکومت ایک عادلانہ بادشاہی نظام کا نمونہ ہو گی لیکن وہاں جا کر ایک عجیب تصویر سامنے آئی۔ افغانستان میں یوں تو امیر صاحب (امیر حبیب اللہ خان) مطلق العنان بادشاہ کی حیثیت سے حکمراں تھے۔ قانون و قواعد صرف ان کی مرضی تھی بظاہر ایک قاضی القضاۃ بھی تھے جو شرعی احکام کے نافذ سمجھے جاتے تھے۔ مگر ان کی اصل حیثیت اعلیٰ حضرت کی مرضی کی مطابق شریعت اسلامی کی توجیہ و تنقید کرنے کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ اعلیٰ حضرت کی ذاتی مشاغل میں مداخلت تو کیا انہیں عین مطابق شریعت ثابت کرنا قاضی القضاۃ صاحب کے وظائف میں داخل تھا۔ مثلاً اعلیٰ حضرت کو بدقسمتی سے عورتوں کی طرف کمال استغراق تھا اور ہر روز ان کے لئے لڑکیاں تلاش کی جاتیں تھیں اور بیش قرار قیمت پر حاصل کی جاتیں تھیں چنانچہ ہمارے اعلیٰ حضرت کے حرم میں شاید نو سو اور ہزار کے درمیان عورتیں تھیں اور بعض لڑکیاں افغانستان کے بڑے بڑے خاندانوں کی چشم و چراغ تھیں یا نورستان کی تھیں۔ ان لڑکیوں کو سورتی کہا جاتا تھا اور اعلیٰ حضرت انہیں بیویاں یا کنیزوں کے طور پر رکھتے تھے۔ میں نے قاضی القضاۃ صاحب سے اس لفظ کی وجہ تسمیہ پوچھی تو انہوں نے کہا کہ سورتی وہ کنیز ہے جسے اعلیٰ حضرت اپنی ذات کے لئے پسند فرماویں۔ میں نے عرض کیا کہ یہ عورتیں لونڈیاں کیوں کر کہلا سکتی ہیں۔ کہنے لگے کہ نورستان کو اعلیٰ حضرت کی فوجوں نے فتح کیا تھا وہاں کی سب عورتیں لونڈیوں کے حکم میں آگئیں۔ اس لئے اعلیٰ حضرت نے حکم دیا کہ وہاں کی کوئی لڑکی شادی نہیں کر سکتی جب تک اعلیٰ حضرت ان کی ولی کی حیثیت سے اجازت نکاح نہ دیں۔ چنانچہ ہر سال وہاں کی تمام لڑکیاں اعلیٰ حضرت کی خدمت میں پیش کی جاتی ہیں۔ اب جن پر اعلیٰ حضرت کی نگہ انتخاب پڑ جاتی ہے وہ تو داخل حرم کر لی جاتی ہیں اور باقی ماندہ کو واپس بھیج دیا جاتا ہے اور انہیں نکاح کی اجازت دی جاتی ہے اب رہیں دوسری لڑکیاں تو ان کے ماں باپ ان لڑکیوں کو خود امیر صاحب کی خدمت میں پیش کرتے ہیں اور اعلیٰ حضرت خوش ہو کر انہیں قبول فرماتے ہیں۔ اور باپ کو انعام دیتے

ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ تو شریعت اسلامیہ کی علانیہ توہین ہے کہنے لگے میاں امیر صاحب کے اعمال پر نکتہ چینی کرنا موت کو دعوت دینا ہے بہتر یہ ہے کہ تم بھی خاموش رہو ورنہ توپ سے اڑا دیئے جاؤ گے۔"

("مشاہداتِ کابل ویاغستان" از مولوی محمد علی قصوری)

یمین السلطنیہ سر کشن پرشاد وزیر اعظم دکن کا سفرنامہ بعنوان "سفرنامہ" 1916ء میں منظر عام پر آیا۔ علاقہ دکن سے متعلق یہ سفرنامہ اہم ترین ماخذ کا درجہ رکھتا ہے۔

سر کشن پرشاد، صاحبِ مطالعہ شخصیت تھے۔ اس دور کی سیاست، معاشرت اور فطرت انسانی سے متعلق ان کے تجزیے خصوصی توجہ کے طالب ہیں۔ یاد رہے کہ اس سے قبل 1897ء میں ان کا پہلا سفرنامہ "سیر پنجاب" شائع ہو کر از حد مقبول ہوا تھا۔ اور اس مقبولیت کا ایک سبب اس کا منظوم ہونا بھی تھا۔ ان کے دوسرے سفرنامے سے اقتباس ملاحظہ کیجئے:

"نواب صاحب موصوف اسیر زنجیر حضرت خواجہ (اجمیری) ہیں۔ زندہ دلی پاکیزہ خیالی علم مجلس میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی سادہ زندگی ان پر اسرار جذبات سے لبریز ہے جن کے لئے طالبانِ حق اپنی عمر کا پورا حصہ صرف کرنے پر بھی حاصل نہیں کر سکتے، اگر کوئی شے انسانی زندگی کی مشکلات کو جن کا اثر انسان پر پڑتا ہے آسانی کے ساتھ انسان بنانے کے قابل بناتی ہے تو وہ ہی قابلِ اعتبار جذبات ہیں جن کا تعلق تزکیہء نفس اور ریاضت سے ہے۔ راحت و اطمینان قلب کی تلاش میں جو شخص جس طرف جاتا ہے اپنی حالت کو قابل اطمینان بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

فطرتِ انسانی پر ایک باریک نظر سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو ہمہ تن اعتبار ہوتا ہے اور اس کی بدولت دنیا اس کو ایک سبز باغ معلوم ہوتی ہے اور ہر چیز سے خواہ وہ خورد سال ہی کیوں نہ ہو امید و اطمینان کی جھلکی نظر آتی ہے۔ اسی کا نام بچپن کی بھولی بھالی سادگی ہے اور یہی وہ چیز ہے جو اس کے ایک سیدھے سادے دل کو زنگِ معصیت سے محفوظ رکھ کر معصومیت کا نورانی حلہ پہناتی ہے، لیکن جب وہ وادی حیات میں قدم بڑھاتا ہے تو بہت جلد اس راہ کی دشوار گزار صعوبتیں اس پر ثابت کر دیتی ہیں کہ ہر چمکدار شے طلائے خالص نہیں ہے اور نہ ہر سبزۂ خوابیدہ تازگی نقشِ روح ہے، بلکہ اکثر اس میں سانپ بچھو انسان کی گھات میں چھپے ہوئے بیٹھے رہتے ہیں، پس ایسی حالت میں اگرچہ اس وحشت خیز تجربے کا ابتدا میں یہ میلان ہوتا ہے کہ انسان اپنے سائے سے بھی ڈرنے لگے

لیکن اگر اس کا دل قوی اور اس کے جذبات کی رہبری کے لئے صحیح اصول تربیت موجود ہوتے ہیں تو اس کو بہت جلد کھوٹے کھرے میں تمیز ہو جاتی ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ انسانی زندگی کیا ہے۔ اور کن پر اسرار جذبات سے اس کو لبریز ہونا چاہئے۔ کچھ شک نہیں کہ نواب صاحب نے ان اسرار کو سمجھ لیا اور اس مسلک کے سالک بننے کے اہل تسلیم کئے جا چکے۔''

(''سیر پنجاب'' از کشن پرشاد)

بیگم ہمایوں مرزا (اصل نام صغرا) کا 'سفر نامہ بھوپال و آگرہ و دلی' 1918ء میں سامنے آیا۔ ان کی سرپرستی میں لاہور سے مجلّہ 'تہذیبِ نسواں' کا اجراء 1898ء میں ہوا تھا۔ آزادی نسواں اور تعلیم نسواں کی حامی خاتون تھیں اور ان کا حلقہ ء اثر سارے ہندوستان کے متوسط طبقے کے اردو داں مسلم گھرانوں تک تھا۔ ان کا یہ سفر بھوپال، آگرہ اور دلی کی ''تہذیبی بہنوں'' سے رابطے کی ایک صورت تھی۔

قاضی عبد الغفار کا سفر نامہ ''نقشِ فرنگ'' (طبع اول 1922) اس زمانے کی یادگار ہے جب قاضی صاحب تحریکِ خلافت کے چند زعماء کے ہمراہ ترکی میں خلافت کے احیاء کے مشن پر لندن گئے تھے۔ قاضی صاحب کا یہ سفر نامہ پڑھ کر 1920 کا وہ زمانہ آنکھوں کے آگے پھر جاتا ہے جب احیائے خلافت کے مسئلہ پر دوٹوک گفتگو کے لئے یہ وفد برطانوی وزیر اعظم لائڈ جارج سے ملنے لندن گیا۔ نمونہ عبارت ملاحظہ ہو :

(1)

''اسی جہاز میں ایک ہندوستانی رانی صاحبہ اور ان کی نوجوان لڑکی بھی انگلستان جا رہی تھیں۔ اس ہنگامہ میں صبح سے شام تک وہ دونوں اپنی کرسیوں پر سب سے الگ بیٹھی رہتی تھیں۔ میں گرچہ اپنے وجود کو جہاز کی اس دنیا سے دور پاتا تھا تاہم دن میں ہر دفعہ جب رانی صاحبہ پر نظر پڑتی تھی تو تخیل کا ایک عجیب ہیولا پیش نظر ہوتا تھا۔ ایک طرف یورپ کے تمدن و معاشرت کے تمام مصنوعات اور نقاشیوں کو دیکھتا تھا۔ چیختی ہوئی نسوانیت سے اکتایا اور بعض اوقات جھنجھلایا کرتا تھا اور دوسری طرف ہندوستان کی ایک عورت اور ایک لڑکی پر نظر پڑ جاتی تھی جو اس فریب نظر میں گھری ہوئی تھیں تاہم اس سے دور تھیں۔ بے پردہ تھیں مگر پردہ میں تھیں۔ بے نقاب تھیں مگر نقاب میں تھیں۔ حیا کا مفہوم اگر کچھ ہے تو اب بھی ہندوستانی عورت کے وجود روحانی میں موجود ہے ازرہ تعصب نہیں کہتا۔ یورپ کے بہت سے اوصاف کا معترف ہوں مگر یہ جو ہر تہذیب و تمدن ان بازاروں میں بہت کمیاب ہے۔

جب ہنگامہ میں رانی صاحبہ کو دیکھتا تھا تو اپنے دماغ میں پاکیزہ نسوانیت کی ایک عجیب تصویر پاتا تھا۔ ایک شہ عرصہ پر ناچ ہو رہا تھا۔ رانی صاحبہ بھی ایک گوشے میں اپنی کرسی پر بیٹھی ہوئی محفل کا تماشہ دیکھ رہی تھیں۔ میں ایک طرف کھڑا سوچتا تھا۔ کہ یورپین نسوانیت کی یہ تصویریں جن پر دنیا بھر کے فنون لطیفہ صرف ہوتے ہیں' انسان کے محسوساتِ عالیہ سے کیوں دور رہتی ہیں۔ یورپ کی عورت شب کے لباس میں جو اس کے لئے زیب و زینت کا مقطع ہے گردن سینہ کے انتہائی حدود تک کھلی ہوئی' بازو بغلوں سے اوپر تک برہنہ 'مرد کے اعلیٰ تخیل کو مس کرنے کے بجائے در حقیقت اس کی مادیت کو متحرک کرتی ہے' ایک موٹی میم صاحبہ کو ہر روز دیکھتا تھا کہ وہ دن میں دو دفعہ لباس تبدیل فرما کر تشریف لاتی تھیں۔ ہر شام کو ان کے لباس میں جدت طرازیوں کا گونا گوں اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ بے چاری وزن میں مولانا شوکت علی سے کم نہ ہوں گی۔ جسم نازک پر لباس فاخرہ کا ٹانکا اپنے میں تاب مقاومت نہ پاکر اور اس کشمکش سے تنگ آکر جو جسم کی ہر حرکت سے اس کے اندر پیدا ہوتی تھی' آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چیختا تھا۔ صحت جسمانی ماشاء اللہ ایسی تھی کہ ہم سے دائم المریض رشک کریں۔ اس دبیز جسم نے نسوانیت کی لطافت و نزاکت کو بالکل دبالیا تھا۔ تاہم وہ جب شب کے نہایت باریک کپڑے پہن کر نکلتی تھیں تو از راہ غایت انکسار اپنے کو پری سے کم نہ سمجھتی تھیں۔ قدم اٹھاتی تھیں تو نظر ہر طرف دوڑتی ہوتی تھی کہ کسی نے دیکھا یا نہیں۔ موٹی کمر لچک نہ سکتی تھی مگر پھر بھی لچکائی جاتی تھی۔ پنجوں پر چلنے کی کوشش کی جاتی تھی کہ یہ بھی ایک "ادا" ہے۔ لیکن جسم نازنین کا وزن لکڑی کے فرش کو تھرا دیتا تھا۔ یہ تو حال تھا لیکن نظر فریبیوں کے زخم نصیب یہاں بھی حاضر تھے۔"

(2) جارج لائڈ سے ملاقات

چلا ہے او دل راحت طلب کیوں شادماں ہو کر
زمین کوئے جاناں رنج دے گی آسماں ہو کر

عمر ستر برس سے کیا کم ہو گی۔ مگر چہرے کی سرخی اور جسم کی ساخت ہندوستان کے بہت سے نوجوانوں کو شرما دے گی۔ جنہوں نے سرکاری یونیورسٹیوں پر جوان ہونے سے پہلے ہی اپنی جوانی نثار کر دی ہے۔ بشرہ سے طبیعت کے سارے جوہر صاف نظر آتے ہیں۔ آنکھیں چھوٹی ہیں مگر غیر معمولی چمک رکھتی ہیں۔ اوپر کے ہونٹ پر بالوں کی ایک گھنی کیاری ہے۔ قد میانہ مگر اس سے بھی کچھ پست ہے۔ سر کے بال کم ہیں۔ مگر جو ہیں وہ گردن کی طرف ہندوستان کے قدیم وضع کی مثل لٹکے ہوئے ہیں۔ فی الجملہ یہ سراپا شاعر کے لئے دلفریب نہ

سی۔ بر طانیہ کی محکوم اقوام کے لئے دل کش نہ ہو۔ مگر علم النفس کے رموز و غوامض پر غور و فکر کرنے والے لوگوں کے لئے یقیناً ایک اچھا "مضمون" ہے۔ ہم لوگوں کے لئے بیٹھتے ہی پہلا جملہ جو مسٹر لائڈ جارج کی زبان سے ادا ہوا۔ میری نظر میں ان کی شخصیت کا ایک اچھا عکس ہے۔ اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں سے جلد جلد ہم سب کے حلیہ کو جانچتے اور پڑ تالتے ہوئے گھنی مونچھوں کے سایہ میں کچھ کچھ مسکراتے ہوئے فرمایا کہ "حضرات آپ کو معلوم ہے کہ آپ کہاں بیٹھے ہیں۔ یہ وہ کمرہ ہے جس میں سلطنت بر طانیہ کی مجلس وزراء کے اجلاس منعقد ہوتے ہیں" ایک ادائے تفاخر ایک کیف پندار 'مرعوب و متاثر کرنے کی ایک بے ہنگام کوشش۔ اس ایک فقرے نے میرے سامنے بر طانوی وزیر اعظم کی شخصیت کو مصور پیش کر دیا۔ گویا فرماتے ہیں کہ ہندوستانی غلام کے لئے اس سے زیادہ کون سا واقعہ مایۂ فخر و مباہات ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے وجود حقیر کو سلطنت بر طانیہ کی وزارت عظمیٰ کے ایوانِ اجلاس میں بیٹھا ہوا پائے۔ اے غلامو! دیکھو آج تمہیں کیسی عزت نصیب ہوئی۔"

("نقشِ فرنگ" از قاضی عبد الغفار)

اس دور کے دیگر سفر ناموں میں اظفری گورگانوی کا "واقعات اظفری" منشی سری رام کا "وقائع سری رام" میاں داد کا "سیر سیاح" لالہ جنید رام کا "سفر نامہ لالہ جنیدہ رام" اور منشی گنیش لعل کا "تحفہ کشمیر" قابل ذکر ہیں۔

سر شیخ عبد القادر نے دو سفر نامے یادگار چھوڑے۔ ان کا پہلا سفر نامہ "مقامِ خلافت" ترکی کی سیاحت (1906) سے متعلق ہے۔ یہ سفر نامہ 1920ء میں شائع ہوا اور اس دور کے مسلم ذہن کا عکاس ہے۔ ان کے دوسرے سفر نامہ "سیاحت نامۂ یورپ" کے بارے میں مولانا صلاح الدین احمد نے لکھا تھا:

"یہ خوبی اور یہ بات ہم نے عبد القادر ہی میں دیکھی کہ وہ کہنے کی بات مزے سے کہہ کر اور دکھانے کی چیز سلیقے سے دکھا کر خود چپکے سے غائب ہو جاتے ہیں"۔

مولانا کی یہ رائے شیخ عبد القادر کے دونوں سفر ناموں سے درست ثابت ہوتی ہے۔ "سیاحت نامۂ یورپ" اور "مقامِ خلافت" سے اقتباسات ملاحظہ ہوں:

(1)

"سوئٹزر لینڈ کا ہر حصہ ویسے تو حسنِ قدرت کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ مگر لوسرن اور اس کے قرب وجوار کو یہاں کی سینری کا خلاصہ کہہ سکتے ہیں۔ حکومت کا صدر مقام اگر برن ہے تو مناظر قدرت کا مرکز لوسرن ہے۔ کوہ الپس کی برف سے ڈھپی ہوئی چوٹیوں کے دیدار

اور اس کے شفاف چشموں کی زیارت کے لئے اس سے عمدہ موقع ملنا مشکل ہے۔ کوہستان کے ہر قابل دید حصے میں یہاں سے پہنچ سکتے ہیں۔ مناظر قدرت کے شیدائی دنیا کے ہر حصے سے یہاں آتے ہیں اور محبوبہ بہار کو بہ صدر عنائی جلوہ گر پاتے ہیں۔"

(سیاحت نامۂ یورپ)

(2)

"مدت سے آرزو تھی کہ استنبول دیکھوں۔ آخر پوری ہوئی۔ اب تین ہفتے سے میں ہوں اور استنبول کی گلیاں۔ نہ وہ ختم ہوتی ہیں۔ نہ میرا شوق۔ یورپ کے اکثر سیاحوں نے لکھا ہے کہ یہ شہر تو لاجواب ہے مگر اس کی گلیاں خراب ہیں۔ گلیوں میں صفائی کا انتظام ٹھیک نہیں۔ ان سے بدبو آتی ہے۔ ان میں قدم قدم پر کتے لیٹے رہتے ہیں۔ یہ سب کچھ سہی۔ لیکن اگر انہیں اس شہر کی بے انتہا دلچسپیوں کی شناخت کے لئے آنکھ دی گئی ہوتی تو وہ ان عیوب سے قطع نظر کر کے اس کے محاسن کو دیکھتے۔ اور اب بھی کئی قدر شناس سیاحوں نے بے حد داد دی ہے۔ یہ عیوب عارضی ہیں۔ بہ نسبت سابق بہت کم ہو گئے ہیں۔ اور امید ہے کہ دن بدن صفائی میں ترقی اور سڑکوں اور راستوں کی درستی پر زیادہ توجہ ہوتی جائے گی۔ دیکھنے کی جو چیز اس شہر میں ہے وہ یہ ہے کہ اس کے بانیوں نے اس کے لئے ایسا موقعہ ڈھونڈا ہے۔ جس نے اسے سارے جہان کا انتخاب بنا دیا۔ ایک طرف ایشیاء اپنی قدامت کو سنبھالے کھڑا ہے اور دوسری طرف یورپ اپنی جدت طرازی پر اترا رہا ہے اور درمیان میں استنبول ہے۔ گویا ایشیاء کا یورپ سے ڈانڈا ملا ہوا ہے۔ ایک طرف سے استنبول یورپ کی اقوام مختلفہ کا مرجع ہے اور دوسری طرف سے ایشیاء کی قومیں اس کی طرف کھنچی چلی آتی ہیں۔ خصوصاً ایشیاء کی مسلمان اقوام اس مقام کی قدرتی خوبیوں اور اس کے تجارتی فوائد کے سوا یہاں مذہبی کشش بھی ہے۔ مزید براں خود ملک کے اندر بھی مختلف مذاہب اور اقوام کی کمی نہیں نتیجہ یہ ہے کہ

جمگھٹا ہے اس میں ترک و فرس و روم و زنگ کا
یعنی گلدستہ ہے اک گلہائے رنگا رنگ کا

پل کی سیر

آؤ تھوڑی دیر کے لئے اس پل پر کھڑے ہو جائیں جو اس خلیج پر بنا ہوا ہے جسے اہل یورپ "شاخ زریں" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ دیکھنے کو تو یہ پل پرانا اور خستہ سا ہے اور سنتے ہیں کہ کسی جرمنی کمپنی کو ایک نیا اور شاندار پل بنانے کے لئے ٹھیکہ دیا گیا ہے۔ مگر اس کی

دقیانوسی ساخت سے درگذر کر کے اس انبوہ پر تو ذرا نظر ڈالو۔ جو پل پر سے گذر رہا ہے۔ بوڑھے، جوان، پرانے، نئے، عورت، مرد، کالے، گورے، فرنگستانی اور ایشیائی کس طرح ملے جلے گذر رہے ہیں۔ کوئی اکڑ کر نہیں چلتا کہ اس مقبول گذرگاہ سے ہو کر نکلنا صرف اسی کے لئے روا ہے۔ مساوات کے اصول کا حق یہاں ادا کر دیا گیا ہے اور تصویر کی بوقلمونی درجہء کمال کو پہنچادی گئی ہے۔ اس سے دل آویز تر تصویر چشم تصور نے بھی نہ دیکھی ہو۔ سرخ ترکی ٹوپیاں اور ان کے کالے پھندنے سب سے پہلے اپنی کثرت کی وجہ سے نظر کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔"

("مقام خلافت" از شیخ عبدالقادر)

1921ء میں مولانا عبیداللہ سندھی کے دو سفرنامے "کابل میں سات برس" اور "ذاتی ڈائری" منشی محبوب عالم کا "سفرنامہ بغداد" مولوی شمس الدین کا "سیاحت افغانستان" سرراس مسعود کا "سفرنامۂ جاپان" اور خواجہ بدرالسلام کا "سفرنامۂ جاپان" شائع ہو کر حد درجہ مقبول ہوئے۔ 1921ء ہی میں سید ابو ظفر ندوی کا "سفرنامہ برما" محبوب المطابع دہلی سے شائع ہوا۔ یہ برما سے متعلق اردو کا تیسرا سفرنامہ ہے جو مغرب کی چکاچوند کے مقابلے میں مشرق کے اس حصے سے متعلق ہے جس کے راستے میں دیو قامت پہاڑ اور متعدد خلیجیں حائل تھیں۔ یہ سفرنامہ برما کی سیاسی، معاشرتی، علمی اور تجارتی زندگی کا عکاس ہے۔ نمونہ عبارت ملاحظہ ہو:

(1)

"9جولائی 15ء صبح اٹھا تو دوران سر بدستور تھا۔ کچھ رات باقی تھی کہ مسافروں میں غل تھا کہ کالاپانی آگیا کالاپانی آگیا۔ مگر میں اس کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ اب جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ دریا نے پانی میں اپنا رنگ بدل لیا ہے اور سیاہ ہو گیا ہے اصل یہ ہے کہ جب تک ساحل دکھائی دیتا رہا۔ پانی کا رنگ میلا سرخی مائل رہا۔ پھر عام پانی کی طرح ہوا۔ بعدہ سبزی مائل۔ کچھ دور جانے کے بعد نیلا ہو گیا اور سمندر آجانے سے سیاہ پانی کی سیاہ رنگت محض گہرائی کے سبب ہے۔ ہوا کا اختلاف اس میں معاون ہوتا ہے۔ ورنہ ہاتھ میں لو یا کسی برتن میں رکھو تو وہ سفید ہی نظر آئے گا۔ ہندوستان میں عموماً کالاپانی سے مراد جزیرہ محبس (جزیرہ انڈمان) ہے چونکہ وہ اسی سمندر میں (کالاپانی) میں ہے اس لئے عام طور پر لوگ اس کو کالاپانی کہتے ہیں۔ آج دن بھر دوران سر کم رہا۔ تاہم لیٹا ہی رہا۔ کیونکہ عافیت اس میں معلوم ہوتی ہے۔ چیزیں اس جہاز پر بہت گراں ہیں۔ چاٹگامی سیلر عموماً چائے کی پیالی دو آنے میں دیتے ہیں۔ درجہ دوم کے ہتلر

سے جو چاہئے لو۔ وہ عمدہ اور اچھی ضرور ہوتی ہے مگر فی پیالی 4 ہے۔ سوڈاواٹر کی بوتل چھ آنے معہ برف ہے۔ سمندر بڑے زور سے ٹھاٹ مار رہا ہے۔ مگر کیا کروں کہ دورانِ سر کے باعث اس پر لطف نظارہ کے دیکھنے کی تاب نہیں۔"

(2)

"رات کا کھانا کھا کر ذرا اوپر چلا گیا (دوسرے درجہ کے ڈک پر) جہاز پر تیسرے درجہ کے مسافروں کو پہلے روز بہت تنگ کیا جاتا ہے اور ہر طرف روک ٹوک ہوتی ہے۔ اور ملازمان جہاز ہر طرف اکڑتے ہوئے فرعون بے سامان نظر آتے ہیں۔ جوں جوں دن گزرتا جاتا ہے نرم پڑتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ آخری دن کوئی کسی کو کچھ کہتا ہی نہیں ہے اور لوگ بھی دلیر ہو کر ہر طرف گھومتے پھرتے ہیں۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور سمندر کا نظارہ دیکھنے لگ گیا اور تھوڑی دیر میں بکثرت مینارہ پر روشنی نظر آنے لگی۔ جو قربت زمین کی بین دلیل تھی۔ ہوا کی خنکی میری برداشت سے جب باہر ہو گئی تو نیچے کے ڈک پر اتر آیا۔ یہاں ایک مولوی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ آپ کا نام عبدالخالق ہے۔ اور شاہ جہان پور کے باشندہ ہیں۔ آپ کی تعلیم دیوبند میں ہوئی ہے۔ اگرچہ فقہی لیاقت آپ کی اچھی ہے مگر منطق کا رنگ بہت غالب ہے۔ بچارے بالکل پرانے خیالات کے آدمی ہیں۔ جدید باتوں سے انہیں سخت نفرت ہے۔ کوئی دس گیارہ بجے رات تک ان سے مختلف مضامین پر گفتگو ہوتی رہی۔"

("سفرنامۂ برما" از سید ابو ظفر ندوی)

1922ء میں شوکت عثمان کا "میری روس یاترا" اور 1923 میں منظر علیم کا "سفرنامۂ مظہری" اور محمد وارث علی "جدید سفرنامہ فلسطین، شام و مصر" سامنے آئے۔ اور خان جواڑی نے اپنا سفرنامہ "تحفۂ بنگال" منظوم لکھا۔

خواجہ حسن نظامی کا سفرنامہ بعنوان "سفرنامۂ مصر و فلسطین و شام" دہلی سے تیسری بار 1923ء میں شائع ہوا۔ یہ سفرنامہ 1911ء کے سفر مصر، فلسطین، شام اور حجازِ مقدس سے متعلق ہے۔ واضح رہے کہ اس کا پہلا ایڈیشن 1912 میں سامنے آیا تھا۔ نمونۂ تحریر ملاحظہ ہو:

"29 جولائی 1911ء صبح بیدار ہو کر سب سے پہلا کام ڈاک لینا تھا۔ حاجی عبد اللہ کے ہمراہ دمشق کی گلیاں چھانیں۔ گندی گلیاں ہیں۔ مگر بعض مقامات پر دہلی کا لطف آتا ہے، پرانے شہروں میں ہر جگہ یہی منظر نظر آتے ہیں۔ ایرانی تاجر کے مکان پر پہنچے تو دروازہ نہایت پست اور بھدا معلوم ہوتا تھا۔ خیال تھا کہ مکان اندر سے نہایت مختصر اور معمولی ہو گا۔

لیکن جونہی اندر داخل ہوئے اس کو بہشت کا ٹکڑا پایا۔ چمن لگے ہوئے تھے۔ فوارے چل رہے تھے۔ سنگِ مرمر کا فرش تھا۔ چھوٹی چھوٹی مرمری نہروں میں پانی بہ رہا تھا۔ تاجر صاحب دروازہ تک لینے آئے اور اندر کمرہ میں لے جا کر بٹھایا۔ یہ کمرہ سیپ کی پچی کاری سے جگ مگا رہا تھا۔"

(سفر نامۂ مصر و فلسطین و شام)

صغریٰ بیگم حیا کا "سفر نامۂ یورپ" 1924ء میں شائع ہوا۔ جو انتہائی باریک بینی کے ساتھ مشرقی اور مغربی تہذیبوں کا موازنہ کرتے ہوئے خالصتاً نسوانی اپروچ کا حامل ہے۔ لیکن 1924ء کا سب سے مقبول سفر نامہ قاضی ولی محمد کا "سفر نامہ اندلس" ہے۔ کویراج مہتہ بلونت سنگھ کا سفر نامہ "سیر تبت" پہلی بار لالہ آسانند ورما اینڈ برادرز' لاہور 1924ء میں شائع کیا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ یہ سفر نامہ یکسر ناپید ہو گیا۔ اس کی بازیافت ڈاکٹر ظہور احمد اعوان نے کی اور اب یہ سفر نامہ ادارہ علم و فن' پشاور سے جولائی 1996ء میں چھپ کر عام ہوا۔ نمونہ تحریر ملاحظہ ہو :

(1)

"چوکی دار وغیرہ بھی کوئی نہ ملا اس لئے وہاں برانڈے میں ہی لیٹ رہے۔ سوچ کیا کہ جو کچھ دینا پڑے گا صبح دے دیں گے۔ سفر سے چکنا چور ہو گئے تھے آج بھی تھوڑے سے ستو کھا کر لیٹ رہے۔ رات کو نیند آرام سے آئی۔ پسوؤں نے تنگ نہ کیا۔

یہاں کے ٹھاکر صاحب کے نام چٹھی لائے تھے لیکن وہ دورا پر تھے اور نہ ملے۔ صبح کو ان کے مکان پر جا کر پتہ کیا تو وہاں سے بھی جواب ملا۔ خیر معلوم ہوا کہ جس کوٹھی کے برانڈے میں ٹھہرے ہیں وہ پادری صاحب کی ہے۔ میں پادری صاحب کو ملنے گیا وہ بڑی اچھی طرح سے ملے۔ ان کے اصلی گھر لداخ میں ہیں اور یہاں پر قریباً ڈیڑھ سال سے مشنری کا کام کر رہے ہیں ان کا لباس لامہ لوگوں کی طرح تھا۔ پہلے پہلے یہاں جرمن مشنری رہتی تھی لیکن لڑائی کے دنوں میں ان کو نکال دیا گیا کیونکہ سرحد پر رہنے کے باعث اس میں کچھ خاص مصلحت منظور تھی۔

پادری صاحب نے کچھ سیب وغیرہ کھانے کو دیئے جو کہ پچھلے سال کے تھے۔ یہاں پھل وغیرہ رکھ لینے سے خراب نہیں ہوتے کیونکہ جگہ ٹھنڈی ہے۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں کہ نیز عدم تعاون کا ذکر چلا تو آپ نے فرمایا کہ اب گاندھی جی کے خیالات حضرت عیسیٰ سے بالکل ملتے ہیں اور شائد وہ عیسائی ہو جاویں۔ انہوں نے برانڈے کی بجائے ایک کمرے

میں رہنے کو کہا۔ ہم نے دال وغیرہ چڑھائی اور روٹی بنانے کی تیاری کی۔ لیکن 4 گھنٹے گزر گئے اور دال ابھی تک نہ پھوٹی۔ مجبوراً سوٹے سے اس کو مالیدہ کرنا پڑا پھر روٹی کھائی اور کپڑے وغیرہ سب دھوپ میں ڈالے۔ تاکہ اگر پسو اس میں کچھ باقی ہوں تو ان سے چھٹکارا ہو۔

صبح کو ہمیں ایک سکول ماسٹر صاحب نے اپنی روٹی وغیرہ کا انتظام کرنے میں و دیگر کاموں کے متعلق بڑی مدد دی۔ ہمیں سارے شہر میں وہی ایک صاحب بڑے ہمدرد ملے اور چونکہ وہ عیسائی تھے اس لئے ہر بات میں جہاں تک ہو سکا انہوں نے امداد دینے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا۔ جس کے لئے ہم ان کے بڑے مشکور ہیں۔ چونکہ روٹی دوپہر کو 5 بجے کے قریب بمشکل تیار ہوئی تھی۔ اس لئے ہم کو شام کے کھانے کی فکر نہ تھی۔ رات کو تھوڑا سا دودھ مل گیا وہ پی لیا۔ صبح قلی وغیرہ کا انتظام ہو گیا اور سویرے ہم کوچ کرنے کے خیال میں رات کو سو رہے۔"

(2)

"22-6-18 آج صبح اتوار کو بطرف ترلوکناتھ روانہ ہوئے۔ پھر اسی راستے پر مڑ کر آنا تھا۔ چلتے چلتے ایک گاؤں میں پہنچے وہاں ایک ننگا سادھو ملا۔ وہ بھی ہمارے ساتھ ہو لیا۔ تھوڑی دور آگے چل کر ہم نے دم لیا سادھو مہاراج نے اشنان کیا۔ پھر فوراً بعد ہی اپنے پاس کی راکھ سارے جسم پر ملنی شروع کی۔ سارے جسم میں بھبھوت مل لیا۔ آخر 9 بجے کے قریب ہم لالوٹا گاؤں میں پہنچے۔ یہ پڑاؤ بھی ہے۔

میاں ٹھاکر صاحب دورہ پر آئے ہوئے تھے ان سے ملے۔ وہ بہت ہی شریف آدمی ہیں۔ بڑی خاطر طور طبع سے پیش آئے ان کا عہدہ نائب تحصیلدار کا ہوتا ہے۔ لیکن یہ اسی علاقہ کے سیاہ و سفید مالک ہیں۔ کام کاج کی بڑی مصروفیت تھی۔ یہاں ہم نے دودھ وغیرہ پیا۔ ٹھاکر صاحب نے ہم کو آیوویدک کی ایک کتاب بھوٹی زبان میں لکھی ہوئی بتائی۔ کتابوں کا اس ملک میں بڑا ہی ذخیرہ ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ ہمارا اس علاقہ میں آنا قبل از وقت ہے اور نہ ہی بوٹیاں نکلی ہیں۔ اصلی موسم بوٹیوں کے لئے جولائی و اگست کا ہے۔ تب ہم آپ کے ساتھ ہو کر مختلف بوٹیاں بتلاتے۔ اور بھوٹی زبان کی کتابیں بھی آپ کو سناتے نیز جو جو ادویات ادھر کے وید استعمال کرتے ہیں۔ ان سے بھی واقفیت کراتے۔

ٹھاکر صاحب خود بھی...... اس فن میں بڑا شوق رکھتے ہیں۔ لیکن کوئی مددگار نہ ہونے کے سبب سے وہ اس علم کی ہمارے فائدے کے لئے خاطر خواہ ترقی نہیں کر سکتے۔ ہم نے آگے جانے کے لئے ان سے صلاح لی تو انہوں نے ترلوکناتھ کا راستہ بڑا خوفناک بتایا ہے

ترلوکناتھ کے مندر میں کوئی انتظام نہیں۔ کاروار سب کچھ آپ ہضم کر جاتا ہے اور سرائے وغیرہ کوئی نہیں۔ جاتریوں کو بڑی سخت تکلیف ہوتی ہے۔ آگے پانگی تک راستہ خراب ہے۔ ایک دو انگریز غرق ہو گئے۔ پہاڑ میں کاٹا ہوا راستہ ہے اور نیچے دریائے چناب بہ رہا ہے اگر ذرا پاؤ پھسلے تو دریا کے نیچے پھر انسان کا پتہ نہیں چلتا۔

انہوں نے صلاح دی کہ قوتی پہاڑ جو کہ اس وقت خوب برف سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کو جانا چاہئے اس علاقے سے نکلنے کا بھی نزدیک راستہ ہے۔ اس لئے سمجھا کہ واقعی قوتی کے جوت کے راستہ جانا بہتر ہوگا۔ واپس کلو کے راستہ ہم جانا نہیں چاہتے تھے کیونکہ وہ بہت فاصلہ تھا۔"

("سیر تبت" از کوی راج مہتہ بلونت سنگھ)

1924ء میں ٹھاکر دت شرما کا "سیر یورپ" 1925ء میں یعقوب کا "مشاہداتِ عرفانی" 1927ء میں پنڈت شو نرائن شمیم کا "سفر نامۂ شمیم" 1928ء میں الیاس برنی کا "صراط حمید" 1929ء میں ڈاکٹر محمد حسین کا سفر نامہ "افغانستان میں میرے اکیس برس" اور شہباز حسین کا "سفر نامہ عراق، عرب و عجم" شائع ہوئے۔

"مولانا محمد علی جوہر کے یورپ کے سفر" مرتبہ: محمد سرور، مولانا کے سفر یورپ بابت 1931ء کا احوال ہے۔ اسی طرح "سیاحت اقبال" مرتبہ: حق نواز، علامہ اقبال کے سفر انگلستان و دیگر ممالک 33-1905ء کی سفری روداد ہے۔

سید سلیمان ندوی کا سفر نامہ "سیر افغانستان" 1933ء کے اس سفر سے متعلق ہے جس میں سید سلیمان ندوی کے شریکِ سفر سر راس مسعود اور ڈاکٹر محمد اقبال بھی تھے۔ کابل کے نادر خان نے ان زعماء کو اپنی ملکی بالخصوص تعلیمی اصلاحات کے سلسلے میں صلاح مشورے کے لئے افغانستان کی دعوت دی تھی۔ سفر نامے سے نمونہ عبارت ملاحظہ ہو:

(1)

"ہم لوگوں کو شاہی مقصورہ میں لے جایا گیا۔ وہاں دوسرے مخصوص اصحاب بھی پہلے سے موجود تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد اعلیٰ حضرت شاہ نادر خان مرحوم تشریف لائے۔ چھریرا بدن، بالا قامت، جسم پر سیاہی مائل مخطط سوٹ، پاؤں میں بوٹ، سر پر کلاہ اور دستار، ہاتھوں میں سپید دستانے، مسجد میں نہایت سادگی کے ساتھ داخل ہوئے۔ اہل مسجد سب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے رہے۔ یعنی جن صفوں سے وہ گزرے وہاں لوگ ان کی تعظیم کے لئے کھڑے

نہ ہوئے اور نہ واعظ صاحب نے اپنا وعظ بند کیا۔ موحد مسلمانوں کی یہ ادا کس قدر موثر ہے کہ خانہ خدا میں غیر خدا کی تعظیم نہیں۔"

(2)

"افغانستان میں ہندوستانیوں کا اچھا خاصا گروہ موجود ہے۔ جس میں سے اکثر سلطنت کے مختلف عہدوں پر سرفراز ہیں۔ ان میں سے دو صاحب ذمہ دار صاحب منصب ہیں۔ ایک شاہ جی سید عبداللہ نائب سالار' یہ پشاور کے رہنے والے ہیں۔ ہجرت کے زمانہ میں افغانستان چلے گئے تھے۔ حکومت نے قدردانی کی اور ان کو اس بلند عہدہ تک پہنچایا۔ دوسرے یہ اللہ نواز خان جن کا ذکر پہلے گذر چکا ہے۔ یہ پہلے شاہی اسٹاف میں باور اول مقرر ہوئے تھے۔ اور اب وزیر امور نافعہ ہیں۔ یہ پہلے شاہی اسٹاف میں باور اول مقرر ہوئے تھے۔ اور اب وزیر امور نافعہ ہیں۔ ان دونوں کے علاوہ بقیہ عہدہ دار تعلیمی' علمی اور انتظامی دائروں میں منسلک ہیں۔ جن میں سے ایک قابلِ ذکر نوجوان مقبول الحق صاحب غازی پوری ہیں۔ یہ شہر غازی پور کے قریب ایک گاؤں جھنشو پور کے رہنے والے ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایف۔ ایس سی کے طالب علم تھے۔ 1921ء میں ترکِ موالات کر کے مولانا محمد علی مرحوم کی جامعہ میں آئے۔ پھر ترکِ موالات کے پراپیگنڈے کا کام کرتے رہے۔ اسی اثنا میں افغانستان میں چند معلمین کی ضرورت کا اشتہار ہندوستان میں شائع ہوا جس کو پڑھ کر انہوں نے بھی درخواست دی جو منظور ہوئی اور اس وقت سے آج تک اس ملک کی خدمت کر رہے ہیں۔ یہ پہلے ایک معلم کی حیثیت سے آئے لیکن اپنی محنت' کوشش اور مطالعہ سے گو گرد سازی میں یہ ترقی کی کہ سرکاری دیا سلائی اور بارود سازی کے کارخانوں میں داخل ہو گئے۔ اور اپنی انتھک کوشش سے سرکاری دیا سلائی کے کارخانہ کو سابق جرمن ماہر گوگرد سے زیادہ کامیابی کے ساتھ چلا رہے ہیں۔"

(2)

"ایک لطیفہ یہ ہوا کہ کسی نے وہاں کی اس اکتوبر کی سردی میں جو ہمارے ہاں کے دسمبر کے برابر تھی' فوارہ کھول دیا۔ لیکن سید راس مسعود صاحب کے کہنے سے جو اس وقت مبتلائے زکام تھے۔ وہ بند کر دیا گیا۔

چائے سے فارغ ہو کر مجمع کا فوٹو لیا گیا اور تعجب ہے کہ علماء نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس کے بعد ہندوستانیوں کی طرف سے مولوی بشیر صاحب نے مہمانوں کے خیر مقدم کی تقریر فرمائی۔ جس میں پہلے حکومت افغانستان کا شکریہ ادا کیا۔ اور وہاں کی موجودہ

حکومت کی تحسین کی اور ہندوستانیوں کے ساتھ اس کی قدردانیوں کی تعریف کی اور پھر ہندوستان کے حالات کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ مایوسی کی کوئی وجہ نہیں مصیبت ہی کے بعد راحت آتی ہے۔ مہمانوں کی طرف سے جوابی تقریر کا فرض میں نے ادا کیا۔ جس کا ایک فقرہ صرف مجھے یاد ہے کہ میں نے اپنے ہندوستانی بھائیوں کو خطاب کر کے کہا کہ "تاریخ میں ہندوستان نے افغانستان کے معاملہ میں کئی دفعہ گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔ اب وقت ہے کہ ہمارے یہ بھائی اپنے حسنِ خدمات سے ان گناہوں کا کفارہ ادا کریں۔"

میرے بعد ڈاکٹر اقبال صاحب نے مختصر تقریر کی اور اسی پر جلسہ ختم ہوا۔ اور ہم لوگ اپنے قیام گاہ کو واپس آئے۔"

("سیر افغانستان" از سید سلیمان ندوی)

سر رضا علی کو ایک قانون دان کی حیثیت میں کئی بار سوویت یونین اور یورپ کی سیاحت کا موقع ملا لیکن انہوں نے اپنے تجربات و مشاہدات کو قلم بند نہیں کیا۔ سر رضا علی کی خودنوشت بعنوان "اعمال نامہ" نومبر 1925ء اور 1935ء کے سفر سے متعلق ہے۔ پہلی بار وہ مسٹر ہیڈیسن کی سربراہی میں ڈیپوٹیشن ممبر کی حیثیت میں جنوبی افریقہ میں بس جانے والے ہندوستانیوں کے حالات سے متعلق تحقیقات کی خاطر جنوبی افرقہ گئے۔ یہ وفد لارڈ ہارڈنگ نے ترتیب دیا تھا جس میں سر رضا علی کی حیثیت ایک ہندوستانی قانون دان کی تھی۔ اس وفد کے دیگر اراکین سر دیوا پرشاد اور گرجا شنکر باجپائی وغیرہ تھے۔ سر رضا علی دوسری بار 1935ء میں بطور ایجنٹ جنرل (ہائی کمشنر) جنوبی افریقہ گئے اور تین برس تک وہاں رہے۔

سر رضا علی کی اس خودنوشت کو اکثر محققین و ناقدین نے سفر نامہ شمار کیا ہے۔ جب کہ در حقیقت ایسا نہیں۔ نمونہ عبارت ملاحظہ ہو۔

"نومبر 1925ء میں پہلی مرتبہ جنوبی افریقہ اس ڈپوٹیشن کا ممبر ہو کر گیا جو مسٹر ہیڈیسن کی صدارت میں لارڈ ہارڈنگ نے ان ہندوستانیوں کے حالات کی تحقیقات کے لئے بھیجا تھا جو اس ملک میں بس گئے ہیں۔ ڈپوٹیشن کے دوسرے ممبر سر دیوا پرشاد سربادھیکاری اور سیکرٹری مسٹر گرجا شنکر باجپی تھے جب ہمارا ڈپوٹیشن پہنچا ہے تو جنوبی افریقہ کے وزیر اعظم جنرل ہرٹ زاگ اور وزیر داخلہ ڈاکٹر ملان تھے۔ ڈاکٹر ملان اب مخالف پارٹی کے لیڈر ہیں۔ میں جنوبی افریقہ دوبارہ 1935ء میں ایجنٹ جنرل (اب اس عہدے کا نام ہائی کمشنر ہے) ہو کر گیا اور تین سال تک اس کا عہدہ کی خدمات انجام دیں۔ اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ میری زندگی کے بدترین اور بہترین تین سال کون سے تھے تو میں کہوں گا کہ 1935ء سے 1938ء

تک کا وہ زمانہ جو میں نے لاچار اور بے بس ہندوستان کا سفیر یا نمائندہ ہو کر جنوبی افریقہ میں گزارا۔ تفصیلی حالات اس کتاب کے دوسرے حصہ میں بیان کئے جائیں گے۔ مختصر یہ ہے کہ جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کی معاشرتی معاملات میں وہی حالت ہے جو ہمارے ملک میں غریب اچھوتوں کی ہے۔ اور اگر جنت کا یہ تخیل صحیح ہے کہ ؎

بہشت آنجا کہ آزارے نہ باشد
کسے رلبا کسے کارے نہ باشد

ترجمہ:۔

"اس جگہ کا نام جنت ہے جہاں انسان کو کوئی تکلیف نہ ہو اور ایک کی ایک کاٹ نہ کرے تو پولٹیکل' اقتصادی' تجارتی اور کاروباری معاملات میں ان کی حالت اچھوتوں سے اسقدر بدتر ہے کہ ہندوستان اچھوتوں کے لئے جنت ہے اور جنوبی افریقہ ہندستانیوں کے لئے دوزخ۔ مجھ جیسے مزاج کے آدمی کے لئے سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ گورنمنٹ آف انڈیا اور برٹش گورنمنٹ کے اثر کے ماتحت ایجنٹ جنزل ہندوستانی نہیں سمجھا جاتا بلکہ اس کے ساتھ وہی مراعات برتے جاتے ہیں جو اس ملک میں گوری رنگت کے آدمی کا پیدائشی حق ہیں۔ گویا ایجنٹ جنزل وہ کوا ہے جس کے جسم کو مور کے پروں سے ڈھک دیا گیا ہے۔ دن رات اپنے تعلیم یافتہ' مہذب و سلیقہ شعار' غیور و دولت مند ملکی بھائیوں کی تذلیل اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور کچھ نہیں کر سکتا۔"

(2)

"سابق ملک معظم ایڈورڈ ہشتم نے جب مسز سمسن کے پیچھے راج پاٹ تجا ہے تو میں لندن میں تھا۔ یہ معاملہ انگلستان کے ایک صوبائی اخبار "یارک شائر پوسٹ" نے اٹھایا تھا۔ مسٹر بالڈون وزیر اعظم اور کنزرویٹو پارٹی نے جو کچھ کیا اس کا حال اخبار بین پبلک سے پوشیدہ نہیں ہے مگر مجھے سخت تعجب ہوا کہ لیبر پارٹی نے بھی بادشاہ کا ساتھ نہ دیا۔ بادشاہ کا غیر شاہی خاندان کی کسی عورت کے ساتھ شادی کرنا ایسی بات تھی کہ جس کا بظاہر مزدور پارٹی کو اس لئے خیر مقدم کرنا چاہئے تھا کہ ان سے ان امتیازات پر جو طبقۂ امراء اور عوام کے درمیان انگلستان میں موجود ہیں' کاری ضرب لگتی تھی۔ چند ہفتے پہلے سابق بادشاہ ایڈورڈ ہشتم ویلس کا دورہ کر کے اور کوئلہ کی کانوں میں جو مزدور بے روزگار تھے ان کے ساتھ دلی اور عملی ہمدردی کا اظہار کر کے پبلک سے خراج تحسین حاصل کر چکے تھے۔ سابق بادشاہ دوستوں اور جاننے والوں سے تعلقات قائم رکھنے میں رسمی قیود و شرائط کی پابندی سے آزاد تھے۔ یہ بھی سب کو

معلوم تھا کہ معاملات میں وہ اپنی ذاتی رائے رکھنے والے فرمانروا ہیں۔ آخر الذکر بات سے مزدور پارٹی غیر مطمئن تھی۔ وہ ایسا بادشاہ چاہتی تھی جس کے عادات و خصائل ایک حد تک اس بات کے ضامن ہوں کہ آئندہ مزدور پارٹی اور کسی اور پولیٹیکل پارٹی کے درمیان تصادم ہونے کی صورت میں فرمانروا طرفدار اور غیر جانبدار رہے گا اور اس کے طریق کار سے مزدور پارٹی کو نقصان نہ پہنچے گا۔"

("اعمال نامہ" از سر رضا علی)

1933ء میں نواب ظہیر الدین کا "سیاحت نامہ" سامنے آیا جو ان کے سفر یورپ و امریکہ کی سفری روداد ہے۔ 1935ء میں مشہور ترک ادیبہ خالدہ ادیب خانم نے ہندوستان کا دورہ کیا اور وطن واپسی پر اپنی سفری روداد قلم بند کی۔ خالدہ ادیب خانم کے اس سفرنامے کو "سفرنامہ اندرون ہند" کے عنوان سے معروف مترجم سید ہاشمی فرید آبادی نے اردو میں ترجمہ کر دیا۔

نشاط النساء بیگم (بیگم حسرت موہانی) کے دو سفرنامے ""سفرنامۂ عراق" 1937ء اور "سفرنامۂ حجاز" (حج نامہ) از حد مقبول ہوئے۔

نشاط النساء بیگم نے اپنے میاں مولانا حسرت موہانی کے ہمراہ 1936ء میں عراق تک کا سفر کیا تھا۔ انہوں نے "سفرنامۂ عراق" قلم بند کرتے ہوئے عراق کے طرزِ تمدن کا گہری نظر سے مشاہدہ کیا اور شگفتہ طرز بیان اپنایا۔

یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ محض سیاسی معاملات اور صحافتی و ادبی مسائل میں ہی حسرت موہانی کا ہاتھ نہیں بٹاتی تھیں بلکہ سفر و حضر میں بھی ان کے ساتھ رہیں۔ ان کا "سفرنامہ" مولانا حسرت موہانی کے دیباچے کے ساتھ 1937ء میں شائع ہوا۔ نمونہ عبارت ملاحظہ ہو' اس سفرنامے کی نمایاں خوبی نسوانی نکتہ نظر سے جزئیات نگاری ہے۔

"یہاں سہ پہر کو دو صاحب ہندی پنجابی آئے اور مولانا کو مع ساتھیوں کے سینما کی دعوت دی۔ ہم لوگ بعد مغرب سب کے سب گئے۔ میں اوپر زنانے میں چلی گئی۔ مرد سب نیچے رہے۔ آدھے گھنٹے کے بعد تماشا شروع ہوا۔ اس میں موجودہ شاہ غازی کی تاج پوشی کا جلوس دکھایا گیا۔ شروع سے آخر تک لاتعداد فوج کی قواعد' موٹروں کی دوڑ دھوپ اور پبلک کا ہجوم شاہ غازی اپنے گھوڑے پر سواروں کی فوج کا معائنہ اور سپاہیوں کو خود بھی سلام کرتے رہے۔ پھر موٹر پر شاہی مکان کو چلے گئے۔ وہاں سے برآمدے میں کھڑے ہو کر شاہی فرمان

سنایا گیا۔"

("سفر نامۂ عراق" از نشاط النساء)

"سنیما میں میرے پاس اتفاق سے دہلی کی ایک ماں اور بیٹی بیٹھی تھیں۔ میاں ان کے سولہ سال سے یہاں ہیں۔ بیوی اور بڑی لڑکی سال بھر سے آئی ہوئی ہیں۔ باپ نے لڑکی کا نکاح ماں کی مرضی کے خلاف ایک تین بچوں کے باپ کے ساتھ کر دیا جن کی پہلی بیوی فوت ہو چکی ہیں وہ بھی ہندوستانی تھیں۔ لڑکے چھوٹے چھوٹے ہندوستان ہی میں ہیں۔ کل یہاں خانقاہ شریف میں دونوں ماں بیٹیاں ملنے بھی آئی تھیں۔ اپنی مصیبت بیان کرتی رہیں۔ مدینے اور مکے میں اپنے لئے دعائیں مانگنے کو کہا۔ ایک دینار جو تیرہ روپے پانچ آنے کا ہوتا ہے۔ سنیما ہی میں دیا تھا کہ دو بکرے 'ایک اپنے اور ایک اپنے بڑے لڑکے کی طرف سے جس کا انتقال ہو گیا ہے' قربانی کر دیئے جائیں اور باقی رقم عرفات میں خیرات کر دی جائے۔

دوشنبہ کی صبح کو پھر انتظام شروع ہوا۔ مقام کرخ کو جو نزدیک ہی ہے پل عبور کر کے گاڑیوں میں بیٹھ کر گئے۔ وہاں ہمارے صاحبان شجرہ اور دیگر بزرگانِ دین کے مزارات ہیں۔ چنانچہ پہلے حضرت جنید بغدادیؒ کے مزار پر گئے۔ بڑا قبہ ہے۔ مسجد بھی ہے۔ اندر بڑا سا صندوق 'جیسے اور سب مزاروں پر ہیں' وہاں تھی۔ صندوق قدِ آدم اونچے لمبے چوڑے ان پر کار چوبی غلاف پڑے ہوتے ہیں خیر ہم نے فاتحہ پڑھا۔ نزدیک ہی دوسرا صندوق حضرت سری سقطیؒ کا تھا۔ وہاں بھی فاتحہ پڑھا۔ اور دو رکعت مسجد میں نماز نفل پڑھ کر واپس آئے۔ زبیدہ خاتوں زوجہ ہاروں رشید کا قبہ بھی نظر آیا تھا۔ دور ہی سے فاتحہ پڑھ لیا تھا۔ پھر گاڑی میں بیٹھ کر .... کرخ میں حضرت معروف کرخی رحمتہ اللہ علیہ کے مزار پر پہنچے۔ اور فاتحہ پڑھا۔ یہ سب ہمارے قادری سلسلے کے بزرگانِ دین ہیں۔ سب جگہ سے فراغت کر کے واپس آئے۔"

("سفر نامۂ عراق" از نشاط النساء بیگم)

(2)

"مولانا نے کہا کہ جلسہ میں چلو تو میں بھی ساتھ ہو گئی۔ اب باہر نکلنے پر سب لوگ جلسے میں چلے گئے اور مجھے نہ لے گئے کہ عورتوں کے جانے کا یہاں قاعدہ نہیں ہے۔ آپ زنانے میں تشریف لے چلئے۔ وہیں دعوت تھی پہلے سے معلوم نہ تھا کہ یہ لوگ کون ہیں۔ کہاں جا کے اجنبیوں کی طرح بیٹھی رہوں گی۔ دعوت کا حال بھی نہ معلوم تھا کہ میری بھی ہے اور یہیں ہے۔ اندر گئی وہاں ان کی بیوی اور دونوں لڑکیاں تھیں۔ ایک انیسہ کے برابر اور ایک دو مہینہ کی انعام سے بڑی موٹی تازی۔ ایک بڑھیا خادمہ بھی تھی یہ لوگ بریلی کے باشندے

ہیں میاں بھی ان کے انجمن کے ممبر یا شاید سیکرٹری ہیں۔ ان کی بیوی کو بھی میں نے سینما میں دیکھا تھا۔ بات چیت بھی مختصر ہوئی تھی۔ یہاں عصر سے لے کر عشا تک بیٹھنا پڑا۔ خود بچاری دعوت کے انتظام میں تھیں۔ ذرا ذرا دیر آکر بیٹھ جاتی اور چلی جاتی تھیں۔ کمرے میں تنہا میں اور چھوٹی لڑکی جس کو یہاں کے دستور کے مطابق' جس طرح تم نے مدینے میں مولانا عبدالباقی صاحب کے یہاں بچے کو لپٹا کسا بندھا دیکھا تھا۔ اسی طرح وہ بھی بندھی ہوئی تھی۔ لبی لمبی علیحدہ جھولے میں۔ لکڑی کا پالنا بڑا سا۔ اس میں گدے تکیہ رضائی کمبل اوڑھے سو رہی تھی۔ پیشاب پاخانے کے وقت اس کا لنگوٹ کھول کر صاحب کرتے اور پھر لپیٹ کر کس کے باندھ دیتے ہیں۔ دودھ سب کے سامنے گریبان سے نکال کے بچے کو پلا دیا اور پھر لٹا دیا بچہ مردہ سا لپٹا ہوا پڑا رہتا ہے۔ یہاں یہی دستور ہے کہ پیدا ہوتے ہی بچے کو نہلا دھلا کر خوب گرم کپڑوں سے جکڑ بند کر کے بالکل الگ جھولے یا کھٹولے میں سلاتے ہیں۔ ماں بچے کو اپنے پاس کسی وقت نہیں سلاتی۔ بالکل علیحدہ اکیلا پڑا رہتا ہے۔ یہ بات ہمارے ہندوستان میں غیر ممکن ہے کہ بچہ الگ پڑا ہے۔ اور ماں آزادی کے ساتھ دوسرے پلنگ پر رہتی ہے۔ صرف دودھ پلا دیا۔ اور پاخانے پیشاب کی خبر لے لی۔ یہاں کے بچوں کی بھی عادت ہو جاتی ہے۔ میرے سامنے ماں آئیں اور لڑکی کا لنگوٹ بدلا' پیشاب کرایا اور ذرا دیر کھلا رہنے دیا۔ اتنے میں وہ خوب رونے لگی' ماں کام سے چلی گئی تھیں میں نے بہت چمکارا' پیار کیا۔ مگر وہ ذرا دیر کے بعد پھر رونے لگی۔ ماں آئیں اور اس کو پھر بڑے سے رومال میں لمبے لمبے ہاتھ پاؤں کر کے باندھ کے ڈال دیا۔ چپ ہو گئی۔ ٹک ٹک دیکھتی رہی اور کچھ دیر کے بعد سو گئی۔"

("سفر نامہ عراق" از نشاط النساء بیگم)

قاضی ولی محمد دبیر نے اردو سفر نامے کو تاریخی' سیاسی اور تہذیبی مطالعے کی صحافتی احوال نگاری کی دیکھی بھالی گزر گاہوں سے باہر نکالا۔ ان کے تین سفر ناموں بعنوان "مغرب اقصیٰ"، "سفر نامہ اسپین" اور "سفر نامہ مصر" میں Non Fiction کی حد بندیوں میں رہتے ہوئے پہلی بار تخلیقی اسلوب نگارش کو اپنانے کا جتن کیا گیا۔ واضح رہے کہ ان کا "سفر نامہ سپین" 1924ء میں سامنے آیا تھا اور دیگر سفر نامے مختصر وقفوں کے بعد سامنے آئے۔ ان سفر ناموں کے علاوہ 20ویں صدی عیسوی کے نصف اول میں لکھے گئے سفر ناموں میں نواب لیاقت جنگ کا "سفر یورپ و امریکہ" اور "سیاحت نامہ" خواجہ احمد عباس کا "مسافر کی ڈائری" 1938ء بریگیڈیر عبدالصمد صارم کا "سفر نامہ صارم" 1938ء اور ہارون خان شروانی کا "جنگ سے پہلے" 1938ء' عبدالغفار خاں کا "ایک نادر سفر نامہ" (مرتبہ: معین

الدین عقیل) شیخ ابن الکریم کا "جلوۂ فرنگ" مولوی عبد الحمید فرخی کا "سفرِ یورپ : آغا محمد اشرف کا "دیس سے باہر" (لگ بھگ 1943ء) محمد عمر علی خان کا "زادِ مغرب" شوکت عثمانی کا "میری روسی یاترا" مولوی عبد الحامد بدایونی کا "تاثراتِ روس" مولوی شمس الدین کا "سیاحتِ افغانستان" سر راس مسعود کا "جاپان کا تعلیمی نظم و نسق" خواجہ بدر الاسلام کا "سفر نامۂ جاپان" خواجہ حسن نظامی کا "روز نامچہ 1907ء" علامہ راشدی الخیری کا "سیاحتِ ہند" لالہ جنید ارام کا "سفر نامۂ لالہ جنید ارام" شنکر داس کا "راجپوتانہ اور میواڑ کی سیر" مہاراجہ جگت جیت سنگھ کا "روزنامچہ سیاحتِ کشمیر" شاہ قدوائی کا "لاہور سے لکھنو اور لکھنؤ سے بھوپال" کیپٹن ادریس کا "سنگ گراں" 1946ء اور نواب لیاقت جنگ کا "سفر یورپ و امریکہ 1946ء خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ واضح رہے کہ کرنل محمد خان کا سفر نامہ "بجنگ آمد" 1940ء تا1947ء کی سفری روداد ہے۔ جو ترتیب تو اسی زمانے میں پا گئی تھی لیکن شائع 1965ء میں ہوئی۔

20ویں صدی کے نصف اول میں ایک چیز اور دیکھنے میں آئی اور وہ یہ کہ مختلف نامور ادباء و شعراء نے اپنے خطوط میں سفر کی روداد لکھ کر مختصر ترین سفر ناموں کی بنیاد رکھی۔ ان مکتوباتی تحریروں کو ہم باقاعدہ سفر نامہ تو نہیں کہہ سکتے ہیں اس خصوص میں بات کرتے ہوئے ان مکتوبات سے کلی طور پر صرفِ نظر مناسب نہیں۔

اس خصوص میں علامہ اقبال' مولانا محمد علی جوہر 'سید سلیمان ندوی' مولانا شوکت علی 'پطرس بخاری 'ڈاکٹر محمد باقر آغا محمد اشرف اور شریف فاروق کے خطوط توجہ کے طالب ہیں۔

علامہ اقبال کے ایک خط سے دو اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

1- "مولوی صاحب مخدوم و مکرم السلام علیکم۔

میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ سویز پہنچ کر دوسرا خط لکھوں گا۔ مگر چونکہ عدن سے سویز تک کے حالات بہت مختصر تھے۔ اس واسطے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ لندن پہنچ کر مفصل واقعات عرض کروں گا۔ میرے پاس ایک کاغذ تھا جس پر میں نوٹ لیتا جاتا تھا مگر افسوس ہے کہ منزلِ مقصود پر پہنچ کر وہ کاغذ کہیں کھو گیا یہی وجہ اب تک میرے خاموش رہنے کی تھی۔ شیخ عبد القادر صاحب کی معرفت آپ کی شکایت پہنچی۔ کل ایک پرائیویٹ خط میں نے آپ کے نام لکھا تھا دونوں خط آپ کو ایک ہی وقت ملیں گے۔"

(مکتوب بنام مولوی انشاء اللہ خان سے اقتباس)

-2

"مارسیلز تک پہنچنے میں چھ روز صرف ہوئے کچھ تو اس وجہ سے کہ سمندر کا آخری حصہ بہت متلاطم تھا اور کچھ اس خیال سے کہ اصلی راستے میں طوفان کا اندیشہ تھا۔ ہمارا کپتان جہاز کو ایک اور راستے سے لے گیا جو کسی قدر لمبا تھا۔ 23 کی صبح مارسلیز یعنی فرانس کی ایک مشہور تاریخی بندرگاہ پر پہنچے۔"

(مکتوب بنام مولوی انشاء اللہ خاں سے اقتباس)

حال ہی میں فاروقی نے علامہ اقبال کی اس نوع کی مکتوباتی تحریروں اور روزنامچوں کو جیاد بنا کر "سفر نامۂ اقبال" کے نام سے علامہ صاحب کے سفرِ انگلستان، فلسطین، فرانس اور اطالیہ 1931ء کی سفری روداد مرتب کی ہے۔

1920ء میں لکھے گئے مولانا محمد علی جوہر کے خطوط سے لندن، فرانس (پیرس۔ سیلان) اور جرمنی کا سفر نامہ بآسانی مرتب ہو سکتا ہے۔ ان کے ایک خط سے اقتباس ملاحظہ ہو:

"اب میں اس خط کا بھی خاتمہ بالخیر کرتا ہوں، ہم سیلان سے جو فرانس کا ایلڈر شارٹ یا راولپنڈی ہے، گزر چکے ہیں اور اب نیلسی سے گزر رہے ہیں جو دائے زے پہاڑوں کے سلسلہ کے پیچھے فرانس کے مدافعتی خط کے وسط میں ہے۔ ممکن ہے کہ اگلا خط اتنا لمبا بھی نہو سکے اس لئے کہ اسی دن میں انگلستان واپس ہو رہا ہوں گا۔ گزشتہ ہفتہ میں ارادہ کر چکا تھا کہ جمعے کے بعد ہی آپ کو خط لکھنا شروع کر دوں گا۔ لیکن نماز جمعہ کے بعد نمازگاہ میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ جماعت سے مذہبی مکالمہ کیا کرتا ہوں اور اس کے بعد آرنلڈ صاحب سے ملنے گیا اور وہاں سے قادیانی جماعت کے ساتھ شب کا کھانا کھانے گیا۔ مگر صرف دعوت ہی نہیں تھی بلکہ پورا استقبال ہو گیا۔"

(ماجد میاں، ظفر الملک اور جعفری کے نام خط سے اقتباس)

1920ء کے سفرِ یورپ میں مولانا محمد علی جوہر کے دیگر شریکِ سفر سید سلیمان ندوی اور سید حسین تھے۔ اس سفر سے متعلق سید سلیمان ندوی نے متعدد خطوط یادگار چھوڑے جنہیں بعد میں "برید فرنگ" کے نام سے کچھ اس طرح مرتب کر دیا گیا کہ یہ خطوط ایک دلکش سفر نامے میں ڈھل گئے۔ کچھ یہی صورت مولانا شوکت علی کے مکتوبات کی بھی ہے۔ مولانا شوکت علی نے یہ خطوط روزنامچہ کے انداز میں لکھے ہیں کچھ یہی سبب ہے کہ ان کے خطوط میں تمام تر تفصیلات سمٹ گئی ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر کے سفرِ آخرت سے متعلق

مولانا شوکت علی کے لندن سے لکھے ہوئے خط کا اقتباس ملاحظہ ہو :

"31 دسمبر کو گلنار بانو کی سالگرہ کے موقع پر محمد علی نے بہت سے احباب کو ہندوستانی شفیع ہوٹل کے تیار کیے ہوئے کھانے کی دعوت دی۔ آج تک کبھی کسی اولاد کی سالگرہ نہیں منائی تھی' جب میں نے منع کیا تو کہا کہ مت روکو۔ میرا اچل چلاؤ کا وقت ہے۔ وہ بھی خوش ہو جائے گی۔ میں اسی دن آئرلینڈ چلا گیا کیونکہ محمد علی کی صحت اچھی تھی اور وہاں جانا ضروری تھا تاکہ مقررہ ملاقاتیں ہو جائیں اور آئرلینڈ کے حالات سے واقف ہو جاؤں۔ چار دن رہ کر واپس آگیا۔ مگر گاڑی ہی میں ساڑھے آٹھ بجے تک رہا۔ ہماری کی کوئی اطلاع نہیں ملی تھی اور کیسے ملتی ہفتہ کے دن صبح کو گھنٹہ بھر نواب عبدالقیوم سے سرحد کے معاملہ پر مفصل گفتگو کی۔ وہ خود سرحد کی کمیٹی کے ممبر تھے اور چاہتے تھے کہ سرحد کے معاملہ میں مسلمان نہایت سختی کے ساتھ کھڑے ہوں اور مطالبات میں کمی نہ کریں۔ اس کے بعد ڈیڑھ گھنٹہ سندھ کے بارے میں سر شاہنواز بھٹو سے گفتگو کی۔ تیسرے پہر کو بیگم عبدالعزیز صاحب لاہور سے دو گھنٹے مسلمان عورتوں اور اسلامی حقوق کے بارے میں باتیں ہوئی' دو دن قبل تین گھنٹے متواتر جوفرے کارہٹ کے سامنے شارٹ ہینڈ والے کو ہندو مسلم مسئلہ پر اپنے خیالات لکھوائے اور دوسرے دن اڑھائی گھنٹے خود اس کے پروف صحیح کیے' پانچ بجے شام کو ہفتہ کے دن ڈاکٹر سے کہا کہ میں تھک گیا ہوں ذرا آرام کرلوں۔ دو گھنٹے آرام کیا۔ جب سات بجے غفلت سے ہوشیار ہوئے تو دماغ درست تھا مگر زبان بند ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر رائلز کو ڈاکٹر انگلشوریا نے بلایا اور انہوں نے کہا کہ دماغ میں خون کی رگیں پھٹ گئی ہیں اور اب کوئی امید نہیں ہے۔ یہ واقعہ قریب گیارہ بجے شب کا تھا' سب کو پہچانتے تھے' سیدھی ٹانگ سیدھے ہاتھ اور سارے جسم پر سیدھی طرف اثر تھا' فالج کا سا۔ دو بجے سے بالکل غافل تھے اور ساڑھے نو بجے دن کے نہایت سکون کی حالت میں دنیا سے کوچ کر گئے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ راجعون۔

عبدالرحمٰن صدیقی' صرف علاوہ نرس کے کمرہ میں تھے۔ انہوں نے سب کو آواز دی اور لوگ بھی آگئے۔ میں انتقال کے پندرہ منٹ بعد پہنچا۔

(خط بنام جعفر صاحب' مطبوعہ "سچ لکھنو")

1926ء کے سفر انگلستان سے متعلق پطرس بخاری کے خطوط بنام امتیاز علی تاج و ڈاکٹر محمد دین تاثیر میں ہر ہر سطر پر پھلجھڑیاں سی چھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ پطرس بخاری کے یہ خطوط سفرنامے کی روایت میں اس اعتبار سے ہمیشہ یادگار رہیں گے کہ اس کے

بعد اردو سفر نامے میں مزاح کا عنصر لازم و ملزوم ہو کر رہ گیا۔ بعد میں آنے والوں خصوصاً جمل الدین عالی اور ابنِ انشا نے اسی روایت کو آگے بڑھایا۔ نمونہ عبارت ملاحظہ ہو :

(1) "10 ستمبر 1926ء دو بجے دو پہر۔

امتیاز بھائی! یہ خط بحیرۂ احمر میں ایک ایسے مقام سے لکھ رہا ہوں جو عدن سے 900 میل کے فاصلے پر ہے۔ ذرا اندازہ لگاؤ' میں اس وقت بمبئی سے ڈھائی ہزار میل کے فاصلے پر ہوں جو پشاور سے ڈیڑھ ہزار میل دور ہے اور ابھی منزل مقصود کا بھی پتہ نہیں۔ اسے کہتے ہیں سفر۔ لاہور سے امر تسر کا سفر اس کے مقابلے میں چہل قدمی سا معلوم ہوتا ہے۔

(2) "تاثیر صاحب کو سلام باقی جو نتھو خیرا ملے اس سے کہیے بخاری نے سلام بھیجا ہے۔"

(امتیاز علی تاج کے نام خطوط کا ابتدائیہ اور اختتامیہ)

ڈاکٹر محمد باقر کے مکتوبات کا سلسلہ بعنوان "لندن سے ایک خط" رسالہ ہمایوں میں شائع ہوا۔ ان سفر نامہ نما خطوط کا نمایاں وصف ڈاکٹر محمد باقر کا علمی انداز تھا۔ نمونہ عبارت ملاحظہ ہو :

"شام کے قریب ہم شہر میں داخل ہو گئے۔ چراغ جل چکے تھے یعنی شہر بجلی سے روشن تھا۔ زمین کے نیچے زمین دوز گاڑیوں کی گڑگڑاہٹ' زمین کے اوپر بسوں' موٹروں' ٹرینوں کی کھڑکھڑاہٹ' پیومنٹ پر لوگوں کا اژدہام' سینماؤں کے جگمگاتے ہوئے چہرے' ریسٹورانوں کے ہجوم' دمدار کوٹوں اور سایوں کی چمک' بانہوں میں بانہیں ڈالے ہوئے جوڑوں کے قہقہے' بوڑھوں کے روٹھے ہوئے چہرے' میکدوں سے نکلنے والے لڑکھڑاتے ہوئے مخموروں کی بانکیں اور ہزاروں قسم کے شور پھر سنائی دینے لگے۔"

(رسالہ "ہمایوں" مارچ 1940ء' ص 197)

آغا محمد اشرف کی مکتوباتی تحریریں بعنوان "لندن سے آداب عرض" ایک زمانے میں انتہائی توجہ سے پڑھی گئیں۔ قرۃ العین حیدر ان پر طنز کرتے ہوئے لکھتی ہیں :

"آغا اشرف کا "بی بی سی سے آداب عرض" تھا کہ کس طرح انگریز نا تسی ہماری کا بہادری سے مقابلہ کر رہے ہیں اور فتح انشاء اللہ اتحادیوں کی ہو گی"

(حوالہ : لندن لیٹر)

اس سلسلے کی آخری کڑی شریف فاروق کے چھے طویل خطوط کا مجموعہ "اتاترک کے وطن میں" ہے جسے ادارہ ادبیات نو لاہور نے 1961ء میں شائع کیا۔ شریف فاروق کے

یہ خطوط ان کے چھ دوستوں کے نام ہیں' جن میں حکیم نیر واسطی کا نام جانا پہچانا ہے۔

20ویں صدی کے وسط میں یوں تو خواجہ حسن نظامی کا "سفر نامۂ پاکستان" 1950ء عبدالماجد دریابادی کا "ڈھائی ہفتے پاکستان میں" 1955ء 'جگن ناتھ آزاد کا "جنوبی ہند میں دو ہفتے" شورش کاشمیری کا "یورپ میں چار ہفتے" غلام حسین شاد کا "سفر نامۂ لکھنو" 1956ء ملا واحدی کا "دلی کا پھیرا" شاد قدوائی کا "لاہور سے لکھنو' لکھنو سے بھوپال" گلزار احمد کا "تذکرۂ انگلستان" 1951ء' ابراہیم جلیس کا "نئی دیوار چین" 1952ء' طفیل احمد خاں کا "سفر ماسکو" 1952ء ' فضل حق شیدا کا "نیا چین" 1952ء ' عبدالقدوس ہاشمی کا "سفر چین" 1957ء 'ارشاد احمد کا "اشتراکی چین" 1957ء عزیز بیگ کا "یہ امریکہ ہے" 1958ء شریف فاروق کا "لنکن کے وطن میں" 1958ء اور عبدالحمید خاں کا "نظرے خوش گزرے" 1955ء سامنے آئے۔ لیکن محمود نظامی کا "نظر نامہ" 1959ء ایک ایسی تحریر ہے جو لکھی تو گئی رپورتاژ کے انداز میں' لیکن شہرت اسے ملی سفر نامے کے طور پر۔ یہاں تک کہ مختلف انتھالوجیز اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں بھی اسے سفر نامہ ہی شمار کیا گیا۔ نمونۂ تحریر ملاحظہ ہو :

"مینارِ کبیر چوتھے شاہی خاندان کے دوسرے بادشاہ خوفو نے اپنے مقبرے کے لئے تعمیر کیا تھا۔ چونکہ قدیم مصریوں کے عقیدے کے مطابق مردے کا تمام اثاث البیت اور سارا دھن دولت اس کے ساتھ دفن کی جاتی تھی۔ اس لئے خوفو کو اس بیش بہا زرومال کی حفاظت کا بہت خیال تھا' جو سالہا سال کی فوج کشی اور پیہم فتوحات سے اس نے ذاتی املاک کے طور پر تاراج شدہ اور باجگزار ملکوں سے جمع کیا تھا۔ اس گنجِ گرانمایہ کو لٹیروں کی دستبرد سے مصئون رکھنے کے لئے اس نے اپنے مرقد کو ایک سنگین حصار کی صورت میں تعمیر کیا۔ جس کی ساخت میں قدِ آدم پتھر کے کئی لاکھ تیس تیس چالیس چالیس من وزنی ٹکڑے استعمال کئے گئے۔ یہ عمارت اپنی بنیادوں پر تقریباً 770 فٹ مربع اور چوٹی تک 485 فٹ بلند ہے۔ اس کے قرب میں اسی خاندان کے دو اور بادشاہوں خائفرع اور منکاؤرع کے دو اہرام بھی موجود ہیں لیکن یہ دونوں اسی مینارِ کبیر کی نقل ہیں اور اپنی بلندی' وسعت اور فنی کیفیت میں اس سے کمتر ہیں۔

مینارِ کبیر کی تعمیر پر ایک لاکھ انسان جو مصر کے مختلف علاقوں اور اس کے زیرِ نگیں

ملکوں سے خاص طور پر اس کام کے لئے لائے گئے تھے ”دس سال تک محنت مزدوری کرتے رہے۔ ان میں سے ہزاروں تعمیر کے دوران ہی مر مٹ گئے اور ہزاروں جو اس کی بنیادوں کے کھلونے وقت عنفوان شباب میں تھے اس کی تکمیل پر جانکاہ مشقت کے ہاتھوں پیش از وقت کہولت اور بڑھاپے کو پہنچ گئے۔ شاید دنیا کی کسی عمارت پر آج تک اتنے انسانوں نے اتنی مدت تک ایسی جفاکشی سے کام نہیں کیا۔ اس عمارت کے لئے سنگ خارا کی چٹانوں کو صحرائے نوبیہ میں تراشا جاتا تھا پہلے یہ عظیم ٹکڑے پہاڑوں پر سے کاٹے جاتے۔ پھر انہیں نیل کے راستے کشتیوں میں ڈال کر جیزہ میں چار سو میل نیچے دریا کے بہاؤ پر لے جاتا جاتا۔ یہاں انہیں رسوں اور زنجیروں کے ذریعے تپتی ہوئی ریت پر سے کھینچ گھسیٹ کر مینار کی جائے تعمیر پر پہنچایا جاتا۔ پھر انہیں جر ثقیل اور ہزاروں سخت جان غلاموں کے قوی ہاتھوں کے توسط سے اوپر کھینچا جاتا اور انسانی ناخن کی دبازت سے بھی باریک روے کے کسی نامعلوم مسالے سے ایک دوسرے کے اوپر جوڑا جاتا۔

اس عمارت کے چاروں طرف ایک مہیب اسرار احاطہ کئے ہوئے دکھائی دیتا ہے اور انسانی فہم حیران رہ جاتی ہے کہ کس طرح ایک زبردست شخص کی ذاتی آرزو کے ایک مہیب خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی خاطر ایک لاکھ زبردست اشخاص دس برس تک اپنا خون پسینہ ایک کرتے رہے۔“

(”نظر نامہ“ از محمود نظامی)

***

جدید دور

وقت گزرنے کے ساتھ جہاں سیاحت نامہ قلم بند کرنے کا نیا شعور پیدا ہوا وہیں ہمارا سفر نامہ نگار' سفر نامے کے بنیادی تقاضوں سے بھی آگاہ ہوا۔ کچھ یہی سبب ہے کہ خالص مذہبی' سیاسی' تاریخی اور صحافیانہ نقطۂ نظر کے حامل سفر ناموں سے اگلا قدم بردباری' علمی شان اور مربوط و خوشگوار بیانیہ کا حامل تھا۔

اب سفر نامہ نگار نے معروضی اور موضوعی' دونوں سطحوں پر ایک توازن قائم کر دیا۔ یعنی معروضی سطح پر جہاں حالات و واقعات کو اہمیت حاصل تھی وہیں موضوعی سطح پر مذہبی' سیاسی' تاریخی اور تہذیبی حالات کے بیان میں سفر نامہ نگار کی اپنی شخصیت بھی جھلک دکھانے لگی۔

یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے نئے سفر نامہ نگار نے روایتی سفر ناموں اور حجاز ناموں کے فرسودہ لوازم کو یہ سوچ کر رد کر دیا کہ یہ فنی معلومات تو راہنما کتب اور سیر و سیاحت سے متعلق ادارے بھی فراہم کر سکتے ہیں۔ لہٰذا سفر نامے کا اول و آخر مقصد کسی علاقے کی تاریخ' جغرافیہ اور بود و باش سے متعلق کوائف جمع کرنا نہیں رہ گیا۔ یوں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سفر نامے کی صف میں بھی نت نئی کارگزاری دیکھنے کو ملی۔

اس خصوص میں آزادی کے بعد پہلا نام سلطانہ آصف فیضی کا دکھائی دیتا ہے۔ سلطانہ آصف کا سفر نامہ ''عروسِ نیل'' 1953ء میں سامنے آیا۔ یہ سفر نامہ نئے رجحانات کی جانب پہلا قدم ہے۔ گو اس کا معیار وہ نہیں جو بیگم اختر ریاض الدین اور قرۃ العین حیدر کے ہاں دکھائی دیتا ہے۔ لیکن ''عروسِ نیل'' میں ایک ایسی اپروچ ضرور دکھائی دیتی ہے جو اس سے قبل اردو سفر نامے میں مفقود تھی۔ ایک کھلی فضا ہے' روایتی جکڑبندیوں سے آزادی کی خواہش ہے اور ایک حد تک آزاد خیالی۔ عین اسی زمانے میں شفیق الرحمٰن نے ''برساتی'' کے عنوان سے سفر نامہ لکھ کر سفر نامے کی صنف کو چار چاند لگا دیئے۔

یہ ایک حد درجہ تخلیقی قلم کار کا سفر نامے کی صنف کی جانب پہلا قدم ہے۔ اور

یہیں سے یہ بحث چھڑی کہ شفیق الرحمٰن کی "برساتی" کو اردو کی پہلے سے طے شدہ تخلیقی اصناف نثر میں شمار کیا جائے یا نہیں۔ ایک اقتباس دیکھتے چلیے:

"میں علی الصبح اٹھا اور سامان باندھنا شروع کر دیا۔ آج میں اڈنبرا کو چھوڑ کر لندن جا رہا تھا۔ پانچ سو میل موٹر چلانی تھی۔ کار میں سامان رکھ کر پڑوسیوں سے علیک سلیک کی اور پروفیسر کے ہاں پہنچا' وہ ناشتے پر میرا منتظر تھا" ایسے موقعے مجھے اداس کر دیتے ہیں۔" وہ بولا "جوانی میں اپنے بچوں کو رخصت کیا کرتا تھا اب بڑھاپے میں شاگردوں کو .... ہم سکاٹ ویسے بھی جذباتی ہیں۔"

اس میز پر ہم نے کتنی مرتبہ لمبی لمبی بحثیں کی تھیں۔ دنیا کے ہر موضوع پر۔

پروفیسر کہہ رہا تھا ...... پینسٹھ برس کی زندگی میں کوئی تجربہ ایسا نہیں جو مجھے نہ ہوا ہو' لیکن جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ مسرت پہنچائی وہ ہے صبح صبح کی چائے کی پیالی اور ایک سگریٹ ...... اس کے بعد دن بھر جو کچھ ہوتا ہے سب خرافات میں شامل ہے۔ لیکن زندگی کچھ ایسی بری بھی نہیں' ہو سکتا تھا کہ میرے والدین شادی نہ کرتے اور میرا وجود ہی دنیا میں نہ ہوتا۔ اچھا ہوا کہ یہ تماشا دیکھ لیا۔ میں زیادہ باتیں تو نہیں کر رہا ہوں .... یہی وقت ہے جب میں بول سکتا ہوں' میری بیوی باہر گئی ہوئی ہے۔"

چلتے وقت اس نے نصیحت کی .... "حدِ نگاہ کبھی محدود نہ رہے۔ ہمیشہ پہاڑوں کے اس پار دیکھنا۔"

میں نے شہر کا ایک چکر لگایا' پھر یونہی خیال آ گیا کہ این سے ملتا چلوں' ویسے کل اسے خدا حافظ کہہ چکا تھا۔ یونیورسٹی میں اس سے ملا' وہ بہت خوش ہوئی۔

"میں تمہیں ڈنبار میں اتار دوں گا' وہاں سے بس لے لینا"

ہم دونوں روانہ ہوئے آبادی سے باہر نکل کر میں نے موٹر روکی اور پیچھے مڑ کر اڈنبرا کے خطِ فلکی کو دیکھا ...... نوک دار مینار' مخروطی گنبد' پہاڑیاں' ...... جیسے قرونِ وسطیٰ کا کوئی شہر ......

"تم تو یوں دیکھ رہے ہو جیسے پھر کبھی یہاں نہ آؤ گے ......"

آؤں گا' لیکن زندگی کے یہ لمحے دوبارہ نہیں آئیں گے ......'

ہم دونوں خاموش تھے۔ این مجھے سگریٹ سلگا کر دیتی' دونوں مسکراتے پھر اداسی چھا جاتی۔ سورج نکل آیا تھا' سکاٹ لینڈ کی پہاڑیوں پر سبزہ مخمل کی طرح بچھا ہوا تھا' کہیں کہیں Heather کے سرخ قالین بچھے ہوئے تھے۔ ہم سمندر کے ساتھ ساتھ جنوب کی

طرف جارہے تھے۔

ڈنبار آگیا۔

"میں بیرک سے ٹرین میں چلی جاؤں گی......"

بل کھاتی ہوئی سڑک' نشیب و فراز' سر سبز پہاڑیاں اور سمندر......

بیرک آگیا۔

"اچھا بس نیو کاسل تک' وہاں میں خود تمہیں ٹرین میں بٹھادوں گا......"

سکاٹ لینڈ کی حدود ختم ہو چکی تھیں' نیلی جھیلوں اور رنگین پہاڑوں کو میں پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ رابرٹ برنز اور اس کے نغمے اونچے پہاڑوں کی دھند اور شہنائیوں کی دل سوز دھنیں سب پیچھے رہ گئے تھے۔ نیو کاسل آیا تو این بھی واپس سکاٹ لینڈ چلی گئی۔

رخصت ہوتے وقت ہم بالکل خاموش تھے۔ "یہ برساتی تم نے نئی لی ہے ؟"

میں نے پہنی ہوئی برساتی کو دیکھا' واقعی نئی معلوم ہو رہی تھی۔ شاید کل جوان نے بغیر پوچھے اسے ڈرائی کلین کرادیا۔

ٹرین جارہی تھی...... این کہہ رہی تھی "اپنی جرابیں مت پھینکنا' مرمت کے لئے مجھے بھیج دینا' کام پر ناشتہ کئے بغیر مت جانا' لوگوں سے لڑنا مت......"

اب میں تیزی سے لندن کی طرف جارہا تھا۔ برساتی کی آستینوں کو دیکھا' پھر کالر اور پیٹی کو...... کیا یہ وہی برساتی ہے ؟ ایسی برساتیاں تو جگہ جگہ دکانوں میں ملتی ہیں۔

کچھ دور جاکر موٹر روک لی' سامنے چشمہ بہہ رہا تھا' ایک پتھر پر بیٹھ کر غور سے برساتی کو دیکھنے لگا...... اس کے کالر پر کسی نے نام لکھا تھا...... یہاں سرخ نشان تھے' یہاں سبز دھبہ...... اس جگہ موم لگا ہوا تھا...... اور اب یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔

وہ برساتی کہاں گئی جو میری رفیق تھی ؟ جس سے طرح طرح کی یادیں وابستہ تھیں۔

وہ دھندلی صبح میری آنکھوں کے سامنے آگئی جب میں پہلے پہلے اڈنبرا آیا' گاڑی پہنچی تو ابھی اندھیرا تھا۔ میں سٹیشن کے ہوٹل میں ناشتہ کر رہا تھا' بیرے نے پردہ ہٹایا تو کھڑکی میں عجیب نظارہ دکھائی دیا' زمین پر دھند چھائی ہوئی تھی' اس دھند سے فصیلیں اور برجیاں ابھر رہی تھیں...... اڈنبرا کا قلعہ پریوں کا محل معلوم ہو رہا تھا۔

سردیاں شروع ہو چکی تھیں' میں اوور کوٹ خریدنے گیا۔ یہاں نوعمر طبقہ برساتی پہنتا ہے اور ادھیڑ عمر کے لوگ اوور کوٹ' بوڑھے برساتی اوور کوٹ اور چھتری تینوں استعمال کرتے ہیں۔

ایک سبز رنگ کی برساتی پر میری نگاہیں جم کر رہ گئیں' اسے پہنا' پیٹی کو کس کر آئینے میں دیکھا تو خوب چست نظر آنے لگا' فوراً اوور کوٹ کا ارادہ ترک کر دیا اور برساتی خرید لی۔

وہ دن جب این سے ملاقات ہوئی' اس مغرور لڑکی کو میں نے کئی مرتبہ یونیورسٹی میں دیکھا تھا ہمیشہ اکیلی ہوتی' سب سے الگ تھلگ پاس سے گزرتے وقت ہم دونوں منہ پھیر لیتے۔ یونیورسٹی کے Rector کا انتخاب ہو رہا تھا' امیدوار کئی تھے لیکن اصل مقابلہ الگزینڈر فلمنگ اور آغا خان کے درمیان تھا۔ سب کو یقین کہ آغا خان یہ دوڑ ضرور جیت جائیں گے' لیکن بالکل ذرا سے فرق سے فلمنگ منتخب ہو گئے۔

دوپہر کو ان کا ایڈریس تھا۔ اڈنبرا کی پرانی رسم ہے کہ ریکٹر کی تقریر کو صرف ایک شخص سنتا ہے...... خود ریکٹر۔

بڑے ہال میں خوب ہنگامہ مچا' ہم قسم قسم کی چیزیں لے کر پہنچے' سیٹیاں' ڈھول' باجے' بطخیں' کبوتر' رتے' چھتریاں' لیکچر شروع ہوا تو کئی طلبا نے چھتریاں لگا لیں جیسے بارش ہو رہی ہے اس گیلری سے رسہ پھینکا گیا جسے دوسری طرف باندھ دیا گیا۔ ایک لڑکا اس سے لٹک کر ہال عبور کرنے لگا۔"

("برساتی" مطبوعہ "سویرا" لاہور شمارہ 15-16)

شفیق الرحمٰن کا "برساتی" جنگ عظیم اور اس کے بعد کی فضا میں یورپ اور مشرق وسطیٰ کی سفری روداد ہے۔

"برساتی" جیسی تو نہیں البتہ "عروسِ نیل" سے ملتی جلتی فضابندی قائم کرنے کے سلسلے میں دو اور نام قابلِ ذکر ہیں۔ 1954ء میں امیر خانم کا سفرنامہ "میرا سفر" شائع ہوا اور 1963ء میں نسرین بانو کا 'الکویت' سامنے آیا۔ لیکن 1963ء کا سال جدید سفرنامے کے چند ایسے معیارات قائم کر گیا' جنہیں ناقابلِ عبور سنگ ہائے میل کہنا چاہیے۔ یعنی بیگم اختر ریاض الدین کا قائم کردہ سفرنامے کے فن کا وہ معیار' جس کی محض خواہش ہی کی جا سکتی ہے۔

سال 1963ء میں بیگم اختر ریاض الدین کا شاہکار سفرنامہ "سات سمندر پار" شائع ہوا۔ کتابی صورت میں شائع ہونے سے قبل یہ سفرنامہ مجلّہ "ادبی دنیا" لاہور میں شائع ہو کر مقبولیت عام کا درجہ حاصل کر چکا تھا اور کتابی صورت میں سامنے آنے پر ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

"سات سمندر پار" دنیا کے چھے بڑے شہروں ٹوکیو' ماسکو' لیننگراڈ' قاہرہ' لندن اور نیویارک کا سفرنامہ ہے۔

بیگم اختر کے میاں اور مولانا صلاح الدین احمد کے بھتیجے ریاض الدین سی ایس پی

فارن سروس میں تھے۔ نتیجہ کے طور پر اختر نے بھی اپنے میاں کے ہمراہ مختلف ممالک خصوصاً جاپان‘ سوویت یونین‘ ہوائی‘ ہانگ کانگ‘ انگلستان اور امریکہ کی تہذیب و ثقافت کا مشاہدہ بہت قریب سے کیا۔

یہ مولانا صلاح الدین احمد (ایڈیٹر ادبی دنیا) ہی تھے جنہوں نے ان کی فطری رجحان (ڈراما نگاری اور مضمون نگاری) کو سفرنامے کی طرف موڑ دیا اور یوں اردو ادب کو ایک بڑی سفرنامہ نگار میسر آئی۔ بیگم اختر ریاض الدین کے سفرنامے میں واقعہ نگاری‘ جزئیات نگاری‘ رنگینی و لطافت اور جرأت اظہار ساتھ تشبیہات اور مزاح کی چاشنی حد درجہ نمایاں ہے۔ نمونۂ عبارت ملاحظہ ہو :

”رات کو ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ صبح نو بجے آنکھ کھلی تو ایک ضعیف و ناتواں سورج کپکپاتے‘ لڑکھڑاتے ہانپتے کانپتے آہستہ آہستہ کمرے میں سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا اور کچھ دیر میں اس کی پیلی زرد دھوپ نڈھال ہو کر برف پر گر پڑی۔ ہم ناشتہ کر کے تیار ہوئے۔ آج صبح ہم صرف کار میں شہر کا جائزہ لیں گے۔ دہلیز پر کھڑے ہو کر باہر جھانکا۔ ذرا سا دروازہ کھولا۔ گردن نکالی‘ ہوا تیز تھی۔ لیکن پھر بھی اتنی سرد نہیں جتنا ڈرایا گیا تھا‘ مفلر لپیٹ کر کار میں بیٹھے تو وہ بھی گرم ”کیا مذاق ہے۔ ارے ہم موسکو ہوا کھانے آئے ہیں‘ ٹھنڈی ہوا۔ گھر جا کر کیا رعب جمائیں گے کہ کتنی سردی کھائی ”گارن شیشے نیچے کرو‘ اور ہیٹر بند کرو“

ہمارا مہذب روسی ڈرائیور گگارن حکم عدولی نہیں جانتا تھا۔ شیشے نیچے ہو گئے‘ کچھ دیر تو لمبے لمبے سانس لے کر ہم سب بہت خوش ہوئے‘ جب سانس جمنے لگا تو شیشے پھر اوپر ہو گئے۔ ہم نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ سفید براق برفوں پر سیاہ لبادے جھکے ہوئے سڑکیں صاف کر رہے تھے۔ موسکو کی خاک روبی بلکہ برف روبی انہیں عمر رسیدہ بوڑھیوں کے سپرد ہے‘ جن کو جھاڑو بہارو کے لئے کمر جھکانی نہیں پڑتی کہ پہلے ہی سے جھکی ہوئی ہے۔ دوسری چیز جو نمایاں طور پر نظر آئی‘ بلکہ سنائی دی‘ وہ تھی خاموشی۔ ٹریفک اول تو مقابلتاً اور ملکوں سے کم تھا۔ اور جو تھا بھی وہ شور نہیں مچاتا تھا۔ مجھے شاذ و نادر ہی ہارن سنائی دیا۔ غالباً سڑکوں کی وسعتیں اور برف کی تہیں شور کو جذب کر لیتی تھیں۔ چند سڑکیں اتنی کشادہ تھیں کہ ایک وقت میں دس دس کاریں ساتھ ساتھ چل سکتی ہیں۔ ٹریفک کے اصول اور قواعد اتنے مشکل ہیں کہ سنا ہے انہیں کو سیکھنے میں خاصہ عرصہ لگتا ہے‘ ویسے بھی کار چلانے کا معیار اتنا بلند ہے کہ ڈرائیونگ لائسنس لینا جوئے شیر لانا ہے۔ کئی امریکن اور انگریز ابتدائی امتحانوں میں فیل ہو جاتے ہیں۔ ان کا گلہ یہ ہے کہ یہ سب روسیوں کی ادنیٰ کارستانی ہے کہ جان جان کر مشکلات

پیدا کرتے ہیں تاکہ ہم لوگ مفلوج و بے کار ہو جائیں۔ واللہ اعلم۔

سرسری نظر میں شہر عموماً اُداس' ماند اور مدھم معلوم ہوا۔ کچھ موسمی سختی' کچھ سیاسی ضبط' کچھ جذباتی بے حسی' نہ رنگین راہ رو نہ خوش باش چہرے' نہ جوانوں کے قہقہے' نہ منچلوں کے آوازے' عمارتیں عموماً بوسیدہ اور پرانی طرز کی تھیں صرف معدودے چند عمارتیں جدید اور فلک بوس تھیں۔ رات کو ان پر لال ستارے غمزہ زن ہیں۔

موسکو کی سڑکیں اس لئے پھیکی اور بے رنگ معلوم ہوئیں کہ دکانوں کی سجاوٹ معدوم' اور...... اس لئے معدوم کہ دکانیں سرکاری ہیں۔ انفرادی اور ذاتی مقابلہ نہ ہونے کی وجہ سے دکانوں کی زیبائش پر کوئی پونجی صرف نہیں کرتا۔ دوسری وجہ سڑکوں کی بے رونقی کی یہ تھی کہ اشتہارات سرے سے غائب تھے۔ میں نے سارے قیام میں صرف دو اشتہار دیکھے۔ ایک تھا "دودھ زیادہ پیو' صحت بناؤ" دوسرا تھا "فضول خرچی اپنے آپ پر اور حکومت پر ظلم ہے" اب امریکہ اور یورپ کے شہروں میں سے اگر اشتہار اتار لئے جائیں تو وہ سب بیسویں صدی کا سوگوار مدفن معلوم ہوں۔"

("سات سمندر پار" از بیگم اختر ریاض الدین)

(2)

"یہاں کے لوگ سرخ و سپید قوی ہیکل نظر آئے۔ البتہ اتنے قد آور نہیں' جتنے میرے ڈراؤنے خوابوں میں نظر آئے تھے۔ درمیانہ قد لیکن ٹھوس فولادی جسم۔ لباس سادہ' چوڑی پتلونیں اور چوڑے چوڑے کوٹ پہن کر اور بھی چوکور نظر آتے ہیں۔ عورتیں بھی ماشاءاللہ ہی ماشاءاللہ' اپنے کوٹوں میں پھٹی پڑتی تھیں۔ اول تو روسی عورتوں کے پاس کمر پتلی کرنے کے لئے وقت نہیں' اوپر سے ان کی سردی نے ان کے رہے سہے فیشن کو اور فرغل میں پہنا کر رکھ دیا ہے۔

اس پر طرہ یہ کہ ہاتھی کی جھول' بھاری لبادے' سڑکوں پر معلوم ہوتا ہے کہ پوستین کے پوٹلے لڑھکتے جا رہے ہیں' پھر ان عورتوں کا چہرہ سنگھاری آمیزش سے مبرا' کوئی عورت سرخی پاؤڈر لگائے دور سے ہزاروں میں ایک نظر آتی ہے' البتہ اب پچھلے چند سالوں میں نوعمر نسل کو فیشن کا شوق چرانے لگا ہے' باہر کے ملکوں کی خبریں سن کر اور تصویریں دیکھ کر جوان لڑکیاں بھی آنکھوں کا میک اپ اور بالوں کی جدید قطع قبول کرنے لگی ہیں۔"

("سات سمندر پار" از بیگم اختر ریاض الدین)

1967ء میں شریف فاروق کا "وفاقی جمہوریہ جرمنی" اور مسرت پراچہ کا "سفرنامۂ

لندن" اور 1969ء میں بیگم اختر ریاض الدین کا دوسرا شاہکار سفر نامہ "دھنک پر قدم" سامنے آئے۔

بیگم اختر ریاض الدین کا "دھنک پر قدم" بھی پہلے پہل مجلہ 'ادبی دنیا' لاہور میں شائع ہو کر مقبول ہوا۔ نتیجہ کے طور پر 1969ء میں بیگم اختر ریاض الدین کو ان کے سفر نامہ "دھنک پر قدم" پر پاکستان رائٹرس گلڈ کے "آدم جی ادبی انعام" سے نوازا گیا۔ نمونۂ تحریر ملاحظہ ہو :

"وین کوور" کے بعد ہمارے جہاز نے سان فرانسسکو کا رخ کیا۔ رات کے گیارہ بجے آسمانی ستاروں کو پشت پر چھوڑتے ہوئے شہر کے برقی ستاروں کو چیرتے ہوئے اترے۔ کسٹم کے تکلفات اور ہوٹل کے غلط پتے کے باعث اپنے کمرے میں پہنچتے پہنچتے ڈیڑھ بج گیا۔ نہا دھو کر نکلی تو سخت بھوک لگی۔ میں ہوائی جہاز میں بہت کم کھا سکتی ہوں۔ اس لئے زمین پر پاؤں لگتے ہی آنتیں غر غر کرتی ہیں۔ دو بجے رات مجھ کو کون کھانا دے گا؟ بچے اور میاں تو سونے کی نیت رکھتے تھے میں تو خالی پیٹ سو ہی نہیں سکتی۔ ڈائننگ روم سو چکا تھا۔ میں ہوٹل سے باہر نکلی۔ ساتھ ہی نکڑ پر ایک ریستوران پر لکھا ہوا تھا "یہ کبھی نہیں سوتا" میں نے کہا مرحبا! یہ ہے ایک زندہ دل شہر کی نشانی۔ اندر گئی تو واقعی رت جگا تھا۔ کئی مرد 'عورتیں' بچے کھا پی رہے تھے۔ میں نے اپنا مرغوب "ٹیونا فش سینوچ" اور ملک شیک کا آرڈر دیا۔

اس شہر کی زندگی دیکھ کر سونے کو جی نہیں چاہتا تھا! خیر تھکی ہوئی واپس لوٹ آئی دوسری صبح ہمارے میزبان مسٹر موئر نہائے دھوئے اپنے قد برابر لمبی کار لے کر دس بجے حاضر۔ غریب نے پانچ دن صبح و شام ہم کو اس بے پناہ 'بے تاب شہر کا چپہ چپہ دکھایا۔

سان فرانسسکو میں امریکنیت سب سے کم ہے۔ اس لئے یہ شہر مجھے سب سے زیادہ بھایا۔ امریکہ میں مجھے رہنے کی کوئی تمنا نہیں۔ لیکن اگر مجبوراً رہنا پڑے تو یہ ایک شہر ہے جہاں میں دو تین سال گزار سکتی ہوں۔ اس شہر کا نہ تو نیویارک کی دم بخت مخلوق سے تعلق ہے جو فلک پیما شکنجوں میں تجارتی دل رکھتی ہے نہ واشنگٹن کی سرکاری فضا سے مشابہت 'جہاں عموماً دفتری حبس اور سیاسی بیدو پار چلتا ہے۔

سان فرانسسکو ایک شہر نہیں' شخصیت ہے اور اس شخصیت کا مخصوص پہلو انفرادیت ہے۔ امریکہ میں شمال سے جنوب تک ایک بیزار کن یکسانیت نظر آتی ہے۔ یہاں ایک تنوع ہے۔ اس کے جغرافیے میں تنوع 'معاشرے میں تنوع 'شہری خدوخال میں جدت' باشندوں میں ہمہ گیر اختلاف 'یہ امریکہ ہے بھی اور نہیں بھی۔ اس شہر نے امریکہ کی لاج رکھ

لی ہے۔ یہ جتنا نیویارک کی فضا سے دور ہوتا جاتا ہے۔ اتنا ہی انسانیت کے قریب تر آتا جاتا ہے، انسان کی طرح یہ بھی ایک وقت میں سب کچھ ہے۔ فراخدل، یہودی صفت، حسین، غلیظ، روشن، تاریک، کبھی ہنگامہ خیز، کبھی خاموش، بیک وقت تخلیقی اور انحطاطی! متعصب مگر پھر بھی روادار اس کی کون تشریح کرے؟

اس شہر کی تاریخ ضعیف ہے۔ یہ خود جوان ہے۔ یہ اپنے افسانوی گزشتہ "طلائی تمدن" کو مڑ مڑ کر دیکھتا ہے۔ ذرا خاموشی سے سنیں تو اس کے سمندری ساحلوں کی بلند موجوں میں کئی شور پنہاں ہیں۔ شروع میں آبی پرندوں کے غولوں کا، پھر ازلی باشندوں کے منتروں کا، کبھی برطانیہ کے "سمندری کتوں" کا، کبھی قدیم مبلغوں کی کلیسائی گھنٹیوں کا۔"

("دھنک پر قدم" از بیگم اختر ریاض الدین)

''دھنک پر قدم'' میں بیگم اختر ریاض الدین کی واقعہ نگاری، جزئیات نگاری، رنگینی و لطافت اور جرات اظہار کا جادو سر چڑھ کر بولا ہے۔

''میرے لیے اس جزیرے (ہوائی) کی سب سے بڑی خوبی اس کی آزادی تھی، ایک روحانی و ذہنی آزادی! اس گمنامی کی آزادی جسے پانے والا ہی جانتا ہے۔ یہاں کوئی نہ بیگم جانے نا مادام، کسی کو آپ کے نام اور کام سے واسطے نہیں۔ سب اپنی اپنی تفریح، اپنی اپنی تفتیش میں مست۔ یہاں عمر کا تفرقہ مٹ جاتا ہے، ذات پات کا امتیاز مٹ جاتا ہے، یہاں بڈھے بھی جوان ہیں، اور سیاحوں میں زیادہ تعداد ان کی ہوتی جو ستر پار کر چکے ہیں۔ ایسی ایسی بڑی بوڑھیاں جو ہمارے ہاں طاق پر بٹھا دی جاتی ہیں کہ تسبیح پھیریں اور قبر کا انتظار کریں، وہاں ''بکنی'' پوشاک پہن کر ساحلوں پر پہنچی ہوتی ہیں۔ عام بازاروں میں سڑکوں پر لوگ ننگے پیر، نیم برہنہ پھرتے ہیں۔ حد ہے کہ کالج یونیورسٹی کی جماعتوں میں حاضری لگانے چلے جاتے ہیں۔''

("دھنک پر قدم" سے اقتباس)

میکسیکو سٹی سے متعلق لکھتے ہوئے اختر ریاض الدین کی باریک بینی ملاحظہ ہو:

"اس شہر کا سب سے نرالا راز یہ ہے کہ اس میں بے شمار ننھی پہاڑیاں ہیں اور ہر پہاڑی میں ایک مخصوص علاقہ بسا ہوا ہے۔ ان علاقوں کا ضروری نہیں کہ صرف شاہراہوں سے رشتہ ناطہ جوڑا جائے کہیں رشتے کی کڑیاں آبی پل ہیں۔ کہیں سنگلاخی یا چوبی زینے۔ مجھے اس کی یہ ادا بہت پیاری لگی۔ یہ انفرادیت اور جگہ بہت کم پائی جاتی ہے مثلاً "ٹیلی گراف ہل" کے بل کھاتے ہوئے موڑ توڑ ہی کو لے لیجئے، یہ شہر کا قدیم ترین محلہ ہے۔ جس کے

ساحلی غاروں میں "گولڈرش" Goldrush کے اولین اچکے آکر بسے تھے اور اندھیر نگری چوپٹ راج مچایا تھا۔ اس وقت یہ سان فرانسسکو کا سب سے دشوار پہاڑی علاقہ ہے۔ جس کا تنوع، بے ٹکا پن شہریوں کو بے حد محبوب ہے۔ اس کی بعض گلیاں اتنی تنگ ہیں کہ ایک کار مشکل سے گزرتی ہے۔ یہ امریکہ کے لئے عجوبہ ہے۔ جس طرح ہمارے ہاں گنٹی بازار و صرافے بازار میں ایک گاۓ نہیں گذر سکتی، بعض گلیاں ایک دم اونچائی پر شروع ہو جاتی ہیں، وہاں نہ سڑک نہ موڑ۔ پیدل چلئے، پتھروں کو کاٹ کر قدمچے بنے ہوۓ ہیں۔ ایک گلی دنیا کی سب سے ٹیڑھی گلی کہلاتی ہے۔ اس میں پانچ سو پھیر بل ہیں۔ چلتے چلتے چکرا جاتے ہیں، بچے وہاں خوب "کیڑی کاڑا" کھیلتے ہیں۔ اس محلے میں بھانت بھانت کے "کرخنداروں" کے شانہ بشانہ فنون کی گیلریاں بھی ہیں۔ یہاں بیٹ تک کے غول کے غول نظر آئے۔ ڈاڑھیاں، منکے، تعفن، نغمے، بے حسی، جوانی، جنسی بد نظمی، گیتا یوگا! احتجاج یہ ہے اس افسانوی نسل کا حلیہ۔ یہ بوہیمین بیل جو پروان چڑھتے چڑھتے نامعلوم کتنے نام اور حلیے بدلے گی۔ فی الحال "ہپ" کہلاتی ہے۔ یہ ماحول کی ناانصافی پر جہاد کرنے کی بجاۓ راہِ فرار اختیار کرتی ہے۔ حکومتی عملے کو حقارت سے Establishment کہہ کر رد کر دیتی ہے، کسی بھی آئیڈیالوجی کو "معاشرتی دروغ" قرار دیتی ہے۔ مایا کی کھوج کو چوہوں کی دوڑ کا نام دیتی ہے۔"

("دھنک پر قدم" از بیگم اختر ریاض الدین)

بیگم اختر ریاض الدین کے دو اہم سفر ناموں کی یکے بعد دیگرے مقبولیت، ذرائع آمدورفت کی سہولتوں اور عالمی سطح پر علمی، ادبی اور ثقافتی رابطوں کے استحکام نے اردو ادب کی کئی اہم افسانہ نگار اور ناول نگار خواتین کو سفر نامے کی صنف کی جانب مائل کیا۔ اس خصوص میں صالحہ عابد حسین اور قرۃ العین حیدر کے نام حد درجہ اہم ہیں۔

صالحہ عابد حسین کا سفر نامہ "سفر زندگی کے لئے سوز و ساز" ایک ایسا آئینہ خانہ ہے جس میں مشرق و مغرب کے کئی ممالک کی سچی تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔ صالحہ عابد حسین ایک ایسی منجھی ہوئی تخلیق کار ہیں کہ ان کا سفر نامے کی صنف کی جانب متوجہ ہونا خود اس صنف کے لئے اعزاز کی بات ہے۔ قرۃ العین حیدر سے دو سفر نامے یادگار ہیں۔ "کوہِ دماوند" ایران کا سفر نامہ ہے اور "گلگشت" یعنی سفر نامۂ روس۔ قرۃ العین حیدر کا جادو رقم قلم ایران اور سوویٹ یونین کو ان کے جملہ عملی، ثقافتی اور تہذیبی حوالوں کے ساتھ ہمارے روبرو پیش کر دیتا ہے۔

اردو سفر نامے کا جدید دور محض سلطانہ آصف فیضی ("عروس نیل" 1953ء) شفیق

الرحمٰن ("بر ساتی") امیر خانم ("میرا سفر" 1954ء) نسرین بانو ("الکویت" 1963ء) بیگم اختر ریاض الدین ("سات سمندر پار" 1963ء اور "دھنک پر قدم" 1969ء) شریف فاروق ("وفاقی جمہوریہ جرمنی" 1967ء) مسرت پراچہ (سفر نامۂ لندن" 1967ء صالحہ عابد حسین ("سفر زندگی کے لئے سوز و ساز") اور قرۃ العین حیدر ("کوہِ دماوند" اور "گلگشت") کے نزول تخلیقی کام تک محدود نہیں۔ 1960ء میں بریگیڈیئر گلزار احمد نے "تذکرہ انگلستان" (1951ء) کے بعد "تذکرہ افریقہ" اور شریف فاروقی نے "لنکن کے دیس میں" (1958ء) کے بعد "اتاترک کے وطن میں" پیش کر دیئے اور اسی سال جمیل الدین عالی کے دو سفر نامے "دنیا مرے آگے" اور "تماشہ مرے آگے" نیز ابراہیم جلیس کا "بنگال میں اجنبی" سامنے آئے۔

جمیل الدین عالی کے دونوں سفر نامے روزنامہ "جنگ" میں قسط وار شائع ہو کر مقبول ہوئے۔ نمونۂ تحریر ملاحظہ ہو:

"بون شاید دنیا کے دارالسلطنتوں میں سب سے کم آبادی کا دارالسلطنت ہے کیونکہ یہاں کی کل آبادی کوئی ڈیڑھ لاکھ ہو گی۔ بعض گلیاں بھاٹی گیٹ کی اندرونی گلیوں سے بھی چھوٹی یعنی کم لمبی چوڑی، ہیں مگر ہیں پختہ صاف اور روشن کھاناوافر ستا۔ مگر ہر قسم کا نہیں ہے۔ یعنی کہیں سے خوشبوئے کچوری نہیں آتی۔

پاکستانی نووارد کے لئے جرمنی غیر زبان (یعنی غیر کفو) سہی مگر ایک شفیق دوست کی طرح ہے جو بے تکلف بھی ہو جائے زبان نہ جاننے کے باوجود مجھے یہاں بہت کم تکلیف ہے۔ روٹی نہیں ملی بن مل گیا۔ بن نہ ملا مرغا مل گیا۔ سور کی پہچان ہو گئی ہے۔ سانپ، بچھو، کھجوروں کا یہاں رواج نہیں اس لئے کھانے پینے کی کوئی دقت نہیں۔ ہر جرمن خلیق اور مہمان نواز نظر آتا ہے۔ اٹک اٹک کر بات کرنے میں وقت بھی لگے تو رہنمائی کرنے میں پتا بتانے سے یا کوئی مشورہ دینے سے گریز نہیں کرے گا۔ بون کا ہر شہری لندن کا بابو لگتا ہے۔ مشہور مہربان شفیق دوست جو آپ کی مدد اپنا فرض سمجھتا ہے۔

اب مشکل یہ ہوئی کہ یونیسکو والوں نے جس دفتر سے میرا رابطہ قائم کرایا تھا وہ بالکل بوگس نکلا۔ میں اخلاقاً اس کا نام نہیں لوں گا کیونکہ اس کی نالائقی سے مجھے جو پریشانیاں ہوئیں وہ عام جرمنوں کی محبت نے دھو دی ہیں مگر اس میں شک نہیں کہ وہ دفتر سخت بیکار ثابت ہوا۔"

("تماشا مرے آگے" از جمیل الدین عالی)

"میں نے ایک باعزت سیاح نظر آنے کے لئے اتنی تیاری کی تھی، مگر جب ان خاتون نے مجھے شک کی بجائے عقیدت سے دیکھا تو میں گھبرا گیا۔ جب ان کی آنکھوں میں مزید نرمی آنے لگی تو میں سب کچھ بھول گیا۔ میں صدق دل سے سمجھا کہ وہ مجھے محمد کاظم یا مستنصر حسین تارڑ یا کم از کم بیگم اختر ریاض الدین احمد سمجھ رہی ہیں۔ جھٹ سے میں نے اپنی عینک بھی اتار لی۔ فوراً سنہری سگریٹ کیس نکالا۔ گولڈن رون سن کے لائٹر سے سگریٹ سلگائی اور انہیں دیکھ کر مسکرایا۔ میں نے ان کی آنکھوں میں آنکھوں گاڑ دیں"

("آئس لینڈ" از جمیل الدین عالی)

1961ء میں مفتی محمد شفیع کا "نقوش و تاثرات" اور صہبا لکھنوی کا "میرے خوابوں کی سرزمین مشرقی پاکستان" 1962ء میں ممتاز احمد خان کا "جہان نما" محمد عزیز کا "لائل پور سے ماسکو تک" ڈاکٹر منظور ممتاز کا "ارض خیام و حافظ" طفیل احمد کا "ماسکو میں اٹھائیس گھنٹے" 1964ء میں سید وجاہت کا "جب میں نے کمال کا ترکی دیکھا" 1965ء میں کرنل محمد خان کا "بجنگ آمد" رازق الخیری کا "مشرقی پاکستان" جی الانا کا "دیس بدیس" احسان بی۔اے کا "روس میں آٹھ دین" 1966ء میں سید وجاہت حسین کا "جب میں نے لینن کا روس دیکھا" اور ابن انشا کے دو سفر نامے "آوارہ گرد کی ڈائری" اور "چلتے ہو تو چین کو چلئے" سامنے آئے۔ ابن انشا کا تیسرا سفر نامہ "دنیا گول ہے" 1969ء میں شائع ہوا تھا۔

ابن انشا ("چلتے ہو تو چین کو چلئے" "آوارہ گرد کی ڈائری" "دنیا گول ہے" اور ابن بطوطہ کے تعاقب میں") نے اپنی فطری مناسبت اور اخباری کی ضروریات کے تحت اپنے سفر ناموں میں علمی سفر ناموں کے رد عمل کے طور پر شگفتہ اسلوب نگارش کو اپنایا اور اس طریقہ کار میں اس حد تک کامیاب ہوئے کہ ہمارے بعد کے سفر نامے کے لئے شگفتہ انداز نگارش کمبل بن کر رہ گیا۔ جس سے تاحال جان نہیں چھوٹی۔ ابنِ انشا کے سفر ناموں سے اقتباسات ملاحظہ ہوں:

"ریل میں ہر نشست کے ساتھ چائے کے گلاس رکھنے کی جگہ ہے۔ اکثر سینماؤں اور تھیٹروں میں کرسی کے دہنے ہتھے کے اندر گلاس رکھنے کے لئے سوراخ بنا ہے کام کرتے جائیے اور ایک گھونٹ چسکتے رہیے۔ تھوڑی دیر میں کوئی آئے گا اور اس میں مزید گرم پانی ڈال جائے گا۔ معلوم ہوا کہ اس سے معدے کا نظام درست رہتا ہے۔ جراثیم کا دفیعہ بھی ہو جاتا ہے۔ کم خرچ بلکہ بے خرچ بالا نشیں، ہم نے بھی کچھ دن گرم پانی پیا۔ پھر چھوڑ دیا۔ کس

برتتے پر تتاپانی۔"

("چلتے ہو تو چین کو چلئے" از ابن انشا)

"اپریل کے مہینے کی چوبیسویں تھی اور اتوار کا روز کہ ہم علی الصبح دیوارِ چین کی زیارت کو روانہ ہوئے۔ یہ پیکنگ سے کوئی پچیس تیس میل کی دوری پر ہے اور چین کا لاکھوں مربع میل علاقہ اس کے شمال میں پھیلا ہے۔ اب سے بائیس تیئیس سو برس پہلے جب یہ بنی تھی تو اس کا مقصد شمال سے تاتاریوں کے حملے کو روکنا تھا۔ تحقیق کہتی ہے کہ جہاں تہاں دیواریں تو مختلف حکمرانوں نے پہلے ہی کھڑی کر رکھی تھیں۔ ہاں شہنشاہ اول چن شہ ہوانگ تی نے 214ء ق م میں ان کو مربوط کیا۔ ان پر برج بنائے اور دھوئیں کے سگنل دینے کا طریقہ رائج کیا جو اس کے پائیہ تخت سیان سے نظر آسکیں، چین والے اپنی زبان میں اس کو دس ہزار میل لمبی دیوار کہتے ہیں لیکن فی الحقیقت یہ ڈیڑھ ہزار میل کے لگ بھگ ہے۔ کہیں یہ پندرہ فٹ اونچی ہے کہیں پچاس فٹ۔ کچھ حصہ بڑی بڑی اینٹوں سے بنا ہے کچھ پتھروں سے۔ دیوار کے زیادہ تر حصے کے ساتھ ایک بیرونی خندق بھی کھدی دکھائی دے گی۔ یہ ڈیڑھ ہزار میل کا تسلسل بھی ٹوٹ گیا ہے۔ کہیں سے ریل در آتی گذرتی گئی ہے کہیں کہیں سڑک بن گئی ہے کہیں امتدادِ زمانہ نے شکست و ریخت کا عمل کیا ہے لیکن جہاں سے ہم نے اسے دیکھا اور اس پر چڑھے وہاں سڑک اسے کاٹ کر نہیں بلکہ اس کے نیچے سے گزرتی ہے۔ سیڑھیاں چڑھ کے ایک برج پر پہنچتے ہیں جس پر چھت بھی ہے۔ وہاں سے چڑھائی شروع ہوتی ہے اور فرش اینٹوں کا ہے۔ یہ اینٹوں کا فرش بعد کا معلوم ہوتا ہے کیونکہ چودھویں اور سولھویں صدی میں بھی اس کی مرمت ہو چکی ہے۔ بایں ہمہ نیچے کے آثار ضرور دو ہزار برس سے زیادہ پرانے ہوں گے۔

یہاں سیر کو آنے والوں کا ہمیشہ ہجوم رہتا ہے اور اتوار کو بالخصوص زیادہ تر لوگ ریل سے آتے ہیں اور ریل کے سٹیشن سے جو غالباً میل بھر دور ہے پیدل۔ اس کے بعد میلوں تک چڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اس روز سردی بھی خاصی تھی۔ یہاں میاں ظل الرحمٰن کا کوٹ کام آیا۔ ہمارے لیڈر پرنسپل ابراہیم خان نے اونٹ کے رنگ کا ایک ڈریس گاؤن نکالا جو اوور کوٹ کا بہت عمدہ کام دے رہا تھا۔ چونکہ اس پر ریشمی دھاگے کی کشیدہ کاری بھی تھی لہٰذا سب نے ان کو خاقانِ چین کا خطاب دیا۔ ہماری پارٹی کے زیادہ تر لوگ پچاس ساٹھ ستر کی عمر کے دائرے میں تھے۔ وہ تو برج کی منڈیر پر بیٹھ گئے، ڈاکٹر وحید قریشی باوجود اپنی جوانی کے چڑھائی چڑھنے سے گھبرائے۔ اعجاز بٹالوی، البتہ ہمیشہ چاق و چوبند رہتے ہیں، اگر کسی پگوڈا پر چڑھنے کی نوبت

آئی تو ہمیں دونوں نے جرأت کی۔ لیکن یہاں دیوار چین کی چڑھائی میں بازی ہمارے ہاتھ رہی۔ اعجاز دو برج پیچھے رک گئے۔ جی تو اور آگے جانے کو چاہتا تھا لیکن ساتھیوں کے ساتھ واپس بھی تو پہنچنا تھا۔ ان آخری دو برجوں کے درمیان چڑھائی اتنی سیدھی ہے کہ ستر پچھتر درجے کا زاویہ بنتا ہوگا۔ اترنے میں گرنے کا اندیشہ زیادہ تھا' جوتا پتھروں پر سے رپٹ رپٹ جاتا تھا اس لئے ہم نے نعلین کو در بغلین کیا یعنی اپنے جوتے اتار کر ہاتھ میں لے لئے۔ جس نے دیکھا' تماشا سمجھا اور چوں نے تو تالیاں بھی بجائیں۔ نیچے اس کے چھوٹا سا چائے خانہ ہے۔ وہاں چائے پی گئی اور پھر دیوارِ عظیم کے سائے میں تصویر کھنچوائی گئی۔ یہ دیوار جبری مزدوری سے بنی تھی۔ ہماری کتاب "چینی نظمیں' میں ایک نوحہ ہے۔ ایک لی لی ینگ چیانگ نو کے میاں کو زبردستی بیگار میں پکڑ کر لے گئے تھے۔ پھر کیا ہوا' معلوم نہیں' غالباً ہزاروں دوسرے مزدوروں کی طرح وہیں مشقت کرتا ہوا مر کھپ گیا۔"

("چلتے ہو تو چین کو چلئے" از ابن انشا)

"ہمارے نقشے کے مطابق شمران جانے والے سڑک تھی۔ وہاں سے دہنے ہاتھ مڑ کر پھر خیابان شاہ رضا پر پہنچے۔ ایک طرف چھوٹی سی کبابی کی دکان تھی۔ جامع مسجد کے جانی کبابی کی نہیں کہ لنگی اور پٹیا باندھے بیٹھا ہو بلکہ یورپ کے کبابی کی۔ کوٹ پتلون ڈانٹے کھڑا تھا اور گیس کے الاؤ پر تکے بنا رہا تھا۔ کچھ کھانے کی تو حاجت نہ تھی۔ دوپہر چیلو کباب جو کھائے تھے۔

ہم نے کہا۔ "آقا کو کا کولا بیارید۔"

"یکتا؟"

"یک عدد"

پھر بولے "یک تا؟"

"بلے بلے" ہم نے رفع شر کے لئے کہا۔

"قصہ یہ ہے کہ آپ کو چار سیب اور پانچ انار چاہئیں تو چار سیب یا پنج انار کہنا کافی نہیں۔ نہ عدد سے کام چلے گا۔ کہئے چہار تا سیب اور پنج تا انار۔ جیسے ہمارے بعض علاقوں میں کہتے ہیں۔ دو ٹھو کیلا تو لاؤ۔ لیکن ہم تو وہاں جتنے روز رہے دوغ پیتے رہے۔ پنجاب کے دیہات کی قدر ترش اور نمکین لسی کا لطف آتا تھا۔ یہ بوتلوں میں بند بھی ملتی ہے۔ کھانے کے بعد ہمیشہ ہم نے خربوزے کی فرمائش کی۔ ہمارا سرداان کا خربوزہ ہوتا ہے لیکن ایرانی خربوزے لطافت خنکی اور شیرینی کے کیا کہنے ہم دیہاتیوں کی زبان میں بالکل گڑ تھا گڑ۔

خیر کوکا کولا کی چسکی لگاتے ہوئے ہم نے دیکھا کہ کبابی نے ایک گاہک کے آگے کباب لا کر رکھا۔ کوئی ڈیڑھ فٹ کا کباب ہوگا۔"

("ابن بطوطہ کے تعاقب میں" از ابن انشا)

1968ء میں خلیل احمد کا "ترکی قدیم وجدید" اور کرنل محمد خان کا "بسلامت روی" 1969ء میں ابن انشا کے "دنیا گول ہے" کے علاوہ نشاط مقبول کا "ترکی ایک نظر میں" جمیل صبا کا "سفر ہے شرط" اور 1970ء میں سید وجاہت حسین کا "جب میں نے کویت دیکھا" اور ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو کا "زہے روانئ عمرے کہ در سفر گزرد" سامنے آئے۔

ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو کا سفر نامہ "زہے روانئ عمرے کہ در سفر گزرد" (طبع اول 1970ء) سیاحتِ امریکہ یورپ سے متعلق ہے اور ڈاکٹر صاحب کا علمی انداز اس سفر نامہ کی نمایاں خوبی۔ چند برس پہلے میں ان کا ایک مضمون بعنوان "احمد امین سے چند ملاقاتیں" (مطبوعہ: اوراق' لاہور جولائی اگست 1984ء) شائع ہوا ہے جو ان کے دوسرے سفر نامے کا باب معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو کی یہ تازہ ترین تحریر سفر مصر (1953ء) سے متعلق ہے۔

1971-72ء میں یکے بعد دیگرے مستنصر حسین تارڑ کے دو سفر نامے "اندلس میں اجنبی" اور نکلے تری تلاش میں" شائع ہو کر مقبول ہوئے۔ ان دونوں سفر ناموں کو ابن انشا کی قائم کردہ روایت کا تسلسل کہنا چاہیے۔ ان سفر ناموں کی حد درجہ مقبولیت کو دیکھتے ہوئے کالم نگار عطاء الحق قاسمی نے بھی اس صنف میں طبع آزمائی کی اور بقول مستنصر حسین تارڑ' عطاء الحق قاسمی نے "شوق آوارگی" (1973-90) کو بالا قساط "فنون" لاہور میں لکھتے ہوئے بیشتر مقامات سے متعلق ان کا چربہ اتارا۔

مستنصر حسین تارڑ نے "اندلس میں اجنبی" اور "نکلے تیری تلاش میں" کے بعد "خانہ بدوش" "ہنزہ داستان" "چیپس" اور "یاک سرائے" کے عنوانات سے چار مزید سفر نامے لکھے جب کہ عطاء الحق قاسمی نے "مسافتیں" کے بعد "شوقِ مکرر" کے عنوان سے ایک غیر ملکی سیاح کے سفر نامہ لاہور کی پیروڈی اور "دنیا خوبصورت ہے" (طبع اول 1997ء) مکمل کی۔ یاد رہے کہ سفر نامے کی پیروڈی لکھنے کی ابتداء غلام الثقلین نقوی نے "لاہور سے لوڈووال" لکھ کر کی تھی۔

بیسٹ سیلر کی دوڑ اپنی جگہ اور تخلیقی جتن اپنی جگہ۔ یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ بیگم اختر ریاض الدین اور ابن انشا کے تخلیقی سفر ناموں کے بعد ممتاز احمد خان کا "جہاں نما" محمد کاظم

کا "مغربی جرمنی میں ایک برس" ڈاکٹر مختار الدین احمد کے "زہے روانی عمرے کہ در سفر گزرد" اور "احمد امین سے چند ملاقاتیں" اور ذوالفقار احمد تابش کا "جزیرہ" اردو کے چند ایسے سفر نامے ہیں جن کی نفسیاتی اور سوشیو پولیٹیکل تجزیہ نگاری اور صوفیانہ وپاکستانی اندازِ نظر کے ساتھ متنوع طاقتور اسلوب نگارش نے اس "محض شگفتہ بیانی" کے روز بروز تنگ ہوتے ہوئے حصار کو توڑنے کا جتن کیا گیا۔ جس نے جدید سفر نامہ نگاروں تک آتے آتے آکاس بیل کی شکل اختیار کر لی تھی اور یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے اردو سفر نامہ اوٹ پٹانگ مزاح نگاری کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔

ممتاز احمد خاں، محمد کاظم، ڈاکٹر مختار الدین احمد اور ذوالفقار احمد تابش کے سفر ناموں سے اقتباسات دیکھتے چلئے۔ آپ محسوس کریں گے کہ یہاں مزاح مقصود بالذات بن کر نہیں ابھرا:

"تہران میں نووارد جناب آقائے ہندی بڑی مشکل میں گرفتار تھے۔ سامنے کی میز بہترین ایرانی غذاؤں سے لدی پڑی تھی، جن کی طرح طرح کی خوشبوئیں رخشِ اشتہا کے لئے مہمیز تھیں اور ادھر ایرانی صاحبِ خانہ تھے کہ مولینا کی باتیں سننے پر مصر تھے اور باہر چمن خانہ سے کھانے کے کمرے تک کوئی دس بار بفرمائید کہہ کر اپنے مہمان کو سلسلہ کلام جاری رکھنے پر مجبور کر چکے تھے۔ اب آکر جو کھانے کی میز پر بیٹھے تو بجائے اس کے کہ ان انواع و اقسام کی نعمتوں سے مہمان کی تواضع کرتے، جس وقت مولانا کی توجہ کھانے کی طرف ہوتی تو نہایت محبت سے بفرمائید کہہ کر ان کو پھر باتوں میں لگا دیتے۔"

("جہاں نما" از ممتاز احمد خاں)

"موسیقی کی اپنی زبان ہوتی ہے، اپنا الہام ہوتا ہے، اور یہ الہام اتنا لطیف اور سیدھا روح میں اترنے والا ہوتا ہے کہ ہمارے لفظوں کی کثافت کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ہم مصوری کے کسی فن پارے کے سامنے کھڑے ہوئے اگر چاہیں تو اس کا الہام اور اس کا پیغام کسی حد تک اپنے الفاظ میں منتقل کر سکتے ہیں لیکن موسیقی کے معاملے میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ موسیقی کا کیف پھول کی خوشبو کی طرح ہوتا ہے جس کے بیان کرنے کے لئے انسان کو الفاظ نہیں ملے۔ یہ صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اپنے قلبِ ناشاد پر وارد کیا جا سکتا ہے۔

کمرے میں اب ہو کا سماں تھا، اور اب سوائے موسیقی کے اس میں اور کسی متنفس کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس دوران میں انسٹی ٹیوٹ والے مکان کی مالکن فراؤ کیونگ دبے پاؤں اندر آئی اور بیئر اور کافی کے خالی برتن آہستہ سے سمیٹ کر بلی کی طرح پنجوں کے بل

چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔ کمرے میں اس وقت جو افراد جمع تھے وہ کرہ ارض کے دور دراز حصوں سے آئے تھے اور ان کے منہ میں دس طرح کی زبانیں تھیں۔ ایک دوسرے سے مختلف اور ایک دوسرے کے لئے اجنبی لیکن ویوالدی کے سُر جو اس کے وائین سے نکل رہے تھے سب کے لئے یکساں طور پر مانوس اور قابلِ فہم تھے۔ ویوالدی اپنے ساز پر ایک ایسی زبان بول رہا تھا جسے سب سمجھتے تھے اور وہ سب کے دلوں میں راستہ بناتی جاتی تھی۔ اس موسیقی کے اثر تلے آ کر یوں لگتا تھا جیسے ہمارے اندر کا سارا میل پگھل گیا ہو اور اس کی جگہ ایک سجل پاکیزگی اور سریلے پن نے لے لی ہو' اور ہم اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اپنی روح کے ساتھ دور کے سنہری جزیروں اور گم شدہ ولایتوں میں اڑتے پھرتے ہوں۔"

("مغربی جرمنی میں ایک برس" از محمد کاظم)

1- "کیمرج کا شہر چھوٹا ہے لیکن بہت خوبصورت۔ شہر کی ساری اہمیت کالجوں کی وجہ سے ہے۔ چھوٹے بڑے بیسیوں کالج ہیں اور ہر ایک اپنے رنگ میں ممتاز لیکن مجھے کنگس کالج اور ٹرینٹی کالج بہت پسند آئے۔ ٹرینیٹی تو ہمارے آکسفورڈ کے کرائسٹ کالج کی ہمسری کا دعوے دار ہے۔ ان کالجوں کی پشت پر دریائے کیم رواں ہے اور اچھے موسم میں ان کا حسن دیکھنے کے قابل ہوتا ہے"

("زہے روانئ عمرے کہ در سفر گزرد" از مختار الدین احمد آرزو)

2- "بیروت سے جب میرا جہاز قاہرہ پہنچا تو آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ شاہ فاروق' مصری تاج و تخت کی صعوبتوں سے دست بردار ہو کر اطالوی جھیلوں کے کنارے آرام کر رہے تھے۔ نجیب' جنہیں عالم مصری "نگیب" کہتے ہیں۔ زمامِ حکومت سنبھالے ہوئے تھے اور ملک کی سیاسی اور اقتصادی بدحالی دور کرنے میں مصروف' انگریز اب بھی اپنا لڑکھڑاتا ہوا اقتدار قائم رکھنے کی سعی لاحاصل کر رہے تھے۔"

("احمد امین سے چند ملاقاتیں" از مختار الدین احمد آرزو)

ذوالفقار احمد تابش کے سفرنامے کا کمال سوشیو پولیٹیکل تجزیہ نگاری اور صوفیانہ لحن کا باہمی ادغام ہے' اور حد درجہ تخلیقی نثر۔ نمونۂ تحریر ملاحظہ ہو :

1- "اس شبِ فراق کی بیٹی نے ہاتھ میں لمبے چمکدار پھل والا چھرا تھام رکھا تھا اور دھڑا دھڑ کنگ کوکونٹ کی گردنیں قلم کر کے گاہکوں کو دے رہی تھی۔ وہ ایک ناریل اٹھاتی' ماہر بولر کی طرح اسے ہاتھ میں گھما کر رخ درست کرتی اور داہنے ہاتھ کے ایک ہی وار سے اس کا سر کاٹ کر گاہک کی طرف بڑھا دیتی۔ اس کی زبان اس کے

ہاتھ سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ چل رہی تھی۔"

("جزیرہ" از ذوالفقار احمد تابش)

2- "میں نے باہر دیکھا۔ سورج دور کہیں درختوں کی اوٹ میں تھا اور مغرب کی جانب سے نارنجی روشنیاں پھوٹ رہی تھیں۔ سڑک کے دو رویہ کھڑے ناریل اور کیلے کے درختوں پر یہ روشنیاں عجیب طور پر جھلملا رہی تھیں۔ کنگ کوکونٹ کے ساتھ لٹکتے ہوئے بڑے بڑے پھل پہلے ہی نارنجی تھے اب ان کا رنگ اور بھی شوخ ہو گیا تھا۔ پہاڑی علاقہ اب بتدریج ختم ہو رہا تھا اور ہم نسبتاً کھلے اور ہموار راستے پر آ گئے تھے۔

بس ایک چھوٹے سے قصبے میں رک گئی۔ ساتھ ہی لڑکوں اور لڑکیوں نے بس پر ہلہ بول دیا۔ وہ کاجو' نارنگی نما پھل' پیشن فروٹ اور ناریل بیچ رہے تھے۔ ان کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ہم لوگ ان سے بچتے بچاتے نیچے اتر آئے۔

"بچو پندرہ منٹ تک واپس آ جانا" یہ مسٹر مہا کی آواز تھی۔

"او کے سر!" ہارون نے نعرہ لگایا اور مجھے ہاتھ سے پکڑ کر گھسیٹ لیا۔

"کچھ کھاؤ پیو گے ؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں یار پیاس تو لگ رہی ہے۔"

"شاہ! آؤ ادھر کچھ پی لیں۔"

"کیا پلاؤ گے۔ ؟" اس نے بھوری مونچھیں پھڑپھڑاتے ہوئے ہماری طرف جھک کر پوچھا۔

ہارون نے میری طرف دیکھا اور بولا "یہ سمجھتا ہے کہ ہم انٹر کون کے بار میں بیٹھے ہیں۔ یہاں تو کوکونٹ کے پانی کے علاوہ کچھ نہیں ملے گا۔"

"سن میری بات سن" شاہ چلایا۔ "اس سے بہتر ہے کہ کچھ مت پیا جائے۔ سادہ پانی یا کوکونٹ سے پیاس بجھانا' پیاس کی توہین ہے۔"

"سمجھتا کیوں نہیں۔"

ہارون نے احتجاج کیا۔

"ہم سفر میں ہیں۔ یہاں کچھ نظر آ رہا ہے تجھے ؟"

ہارون نے چاروں طرف انگلی گھما کر کہا۔

"ہاں" شاہ نے سرگوشی کی۔ "ادھر دیکھ وہاں تاڑی ملے گی۔"

"یار میں تو نہیں پی سکتا۔ اور تو جانتا ہے یہ تابش کا چچہ۔ یہ ملا بھی تو ہمارے ساتھ ہے۔"

"اسے دفع کرو۔ تم مجھے تاڑی پلا دینا۔ خود جو جی چاہے پینا۔"

سرکنڈے اور بانس کے بنے ہوئے اس جھونپڑے کا تھڑا چڑھ کر جب ہم "بار" میں پہنچے تو ایک ضعیف العمر سنہائی عورت نے ہمارا استقبال کیا۔ شاہ نے اپنا مدعا بیان کیا لیکن وہ بیچاری ہمارا مدعا سمجھنے سے قاصر تھی۔ ننگ دھڑنگ بچے ہمارے گرد جمع ہو گئے تھے۔ ان میں سے کچھ اشاروں سے خیرات مانگ رہے تھے اور زور زور سے چیخ رہے تھے۔ کچھ آپس میں اس بات پر الجھ رہے تھے کہ پہلے اسے خیرات ملنی چاہئے۔"

("جزیرہ" از ذوالفقار احمد تابش)

نئے دور میں ڈاکٹر محمد اجمل' انتظار حسین' رام لعل' جوگندر پال اور شیخ رحمٰن اکولوی کی معرفت مختصر ترین سفر ناموں کا چلن عام ہوا۔ ڈاکٹر محمد اجمل کا "چند روز فرانس میں" ("فنون لاہور") انتظار حسین کے تین مختصر سفر ناموں کا مجموعہ "زمین اور فلک اور" (1984ء)' رام لعل کا "لندن اے لندن" جوگندر پال کا "پاکستان کی یاترا" (مطبوعہ : اوراق) شیخ رحمٰن اکولوی کا "الف سے قطب مینار" (مطبوعہ "کتاب نما" دہلی 1984ء) اس نوع کی ابتدائی تحریر شمار ہوں گی۔ اور اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا۔ یوں اکرام اللہ' حسین شاہد' پرتو روہیلہ' راغب شکیب' عبدالحمید اعظمی' بلدیو مرزا' ڈاکٹر صغریٰ مہدی' ریحانہ سلیم' حمیدہ جبیں' ہارون رشید' نوشابہ نرگس' سلمیٰ یاسمین نجمی' بلقیس ظفر اور کارٹونسٹ جاوید اقبال نے مختلف اخبارات وادبی و نیم ادبی جرائد میں مختصر سفر نامے لکھے۔ مختصر ترین سفر ناموں میں سے چند اقتباسات ملاحظہ کیجئے۔

"رات بھر اپنے میزبانوں پر غصہ آتا رہا کہ مجھے یہ معمولی سا کمرہ دیا ہے۔ یہ کہاں کی مہمان نوازی ہے! سویا بھی خوب' بہت خواب آئے جن میں سے فقط یہ یاد ہے کہ ایک فرانسیسی عورت اور میں ایک کار میں جا رہے ہیں اور ایک چھوٹا سا لڑکا کار چلا رہا ہے۔ ایک جگہ سڑک خراب ہے اور وہ لڑکا بائیں طرف موڑ کر ایک پہاڑی پر کار کو لے جاتا ہے اور پھر نہایت خطرناک طریقے سے پہاڑوں سے نیچے کار کو لاتا ہے۔ پہاڑی پر سے اترائی بالکل سیدھی ہے لیکن وہ بہر حال کار کو نیچے لے آتا ہے اور میں اس لڑکے کو بہت ڈانٹتا ہوں۔ صبح جب اٹھا تو ماحول سے خفگی بہت حد تک ختم ہو چکی تھی اور میں نیچے Salon میں جا کر ناشتہ کیا۔ ناشتہ کرنے کے بعد طبیعت میں کچھ ٹھہراؤ آگیا ہے۔ یہی کمرہ اب اچھا لگنے لگا ہے۔ سوچتا ہوں کہ

پہلے یہ کمرہ اس لئے تو برا نہیں لگا تھا کہ پاکستانیوں میں جگ ہنسائی ہو گی تو یہ میرا اپنا احساس تو نہیں تھا کہ کمرہ برا ہے۔ رتبے کا احساس، لوگوں کی توقعات کا احساس ہے اپنا ذاتی احساس تو نہیں Introject کس طرح دماغ میں سما جاتے ہیں۔ کہیں فرانس آنا بھی کسی Introject ہی کی بدولت تو نہیں تھا کہ لوگ رشک کریں گے کہ فرانس گیا ہے۔ فرانس کی کشش دل کی تہہ میں یہ تھی کہ احمد ابوبکر سے ملوں گا اور ان سے روحانی فیض حاصل کروں گا' اور اس طرح شاید اپنی بکھری ہوئی شخصیت میں کسی قدر جمعیت پیدا ہو اور سکون سے آشنا ہو جاؤں لیکن سب لوگ یہ سمجھتے ہیں اور اپنی بیوی اور بچوں کو بھی میں معقول وجوہات بناتا رہا کہ وہاں یونیورسٹیاں دیکھنا ہیں' مدرسے دیکھنا ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح ہر داخلی کشش کو میں لوگوں سے پوشیدہ رکھتا ہوں کیونکہ اگر انہیں معلوم ہو گیا تو وہ مجھ پر ہنسیں گے اور یہ عجب سی بات ہے کہ جب لوگ مجھ پر ہنسیں تو مجھے سب سے پہلے اپنے جسم کی کم قدری کا احساس ہوتا ہے گویا یہ جسم حقیر ہے' سکڑ گیا ہے...... اور اس کے بعد اپنے ذہین کی تحقیر کا...... اگر مغرب کا جرم یہ ہے کہ اس نے روح کو نظر انداز کیا تو ہم نے اپنے آپ پر یہ ستم کیا کہ ہم نے جسم کو شعوری طور پر ایک حقیر مقام دیا۔"

("چند روز فرانس میں" از ڈاکٹر محمد اجمل مطبوعہ :"فنون" لاہور)

"10 ستمبر 1978ء

رات بارہ بجے کے بعد قیام گاہ پر پہنچا تھا۔ سب لوگ بے خبر سو رہے تھے۔ ہر چرن چاولہ نے یہ بہت اچھا کیا تھا کہ جب انگرڈ اور میں کرسٹا کے سنسان اسٹیشن پر ایک کھمبے کے نیچے تنہا کھڑے تھے تو وہ مجھے چابی دے کر خاموشی سے لوٹ گیا تھا۔ اگرچہ وہ بہت دیر سے (بقول اس کے) فکر مند سا ہو کر کئی لوکل گاڑیاں دیکھ چکا تھا لیکن مجھے انگرڈ کے ساتھ دیکھ کر بظاہر مطمئن سا لوٹ گیا تھا۔ میں نے چابی لگا کر دروازہ کھولا اور اپنا بریف کیس اٹھا کر کامن کچن میں جا بیٹھا۔ گھنٹہ بھر تنہا بیٹھا اپنے مسودے کا آخری باب مکمل کرتا رہا۔ پھر اچانک وہاں دو نارویجین پڑوسی آ گئے۔ وہ کافی دیر سے کسی کلب سے یا اپنی اپنی جاب سے لوٹے تھے۔ انہوں نے پہلے تو میرے ساتھ ذہسئی' کا پُر خلوص تبادلہ کیا پھر الیکٹرک چولہے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا مڈ نائٹ بریک فاسٹ تیار کرنے لگے۔ مجھے لکھنے میں مصروف دیکھ کر انہوں نے آپس میں بھی سرگوشیوں میں ہی بات کی۔ ارنے بون دول کو شاید اتنی بھوک نہیں لگی تھی۔ وہ میرے لئے بھی کافی کا ایک پیالہ رکھ کر جلدی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ سویرے ڈالن کافی اور ناشتہ لے کر ایک الگ میز پر بیٹھ گیا۔ کئی منٹوں تک یا تو میرے

کاغذات کے پھڑ پھڑانے کی آواز آتی رہی یا پھر ڈالن کے ناشتہ چبانے کی۔ جب میں نے اپنا کام ختم کر لیا اور صفحات کی ترتیب دینے لگا تو ڈالن کے ساتھ گفتگو بھی شروع کر دی۔ اسے جب میری کام کی نوعیت معلوم ہوئی تو اس نے مجھ سے ان نارو تجئین رائیٹرس کے نام پوچھے جن کے بارے میں میں نے اظہار رائے کیا تھا۔ اس نے بعض رائیٹرس کے ساتھ تو پورا اتفاق کیا جو واقعی نام پیدا کر چکے تھے لیکن بعض کو اس نے معمولی درجے کا قرار دیا اور چند ناموں کے بارے میں تو اس نے بالکل لاعلمی کا اظہار کیا۔"

(''لندن اے لندن'' از رام لعل۔ اوراق' لاہور)

''جن لوگوں کو اپنے آپ کو محض مجلسی طور پر ادیب منوانا ہوتا ہے' وہ اکثر مراعات' اقتدار اور شہرت کے موقعوں کی تاک میں لگے رہتے ہیں' لیکن انسانی لدیت کے خواب دیکھنے والے ادباء جانتے ہیں کہ خون میں لت پت ہوئے بغیر نئی زندگی کو جنم نہیں دیا جا سکتا۔ ایسے سچے ادیب ہر ایک ملک میں معدودے چند ہوتے ہیں۔ پاکستان کے سچے تخلیق کار بھی ہر نوع کے تعصبات سے آزادی کی جدوجہد میں جٹے ہوئے ہیں' وہ نجی تعصبات بھی' جن کی محبوبیت سے ان کے باطن کی پسپائی کا احتمال ہو اور وہ بھی جو انہیں خارجی طور پر ہانک لے جانے میں لگے ہوئے ہوں۔

ڈاکٹر ایوب مرزا ایک ادھیڑ عمر کے معالج اور بائیں بازو کے نظریئے کے شاعر ہیں اور جمیل آذر کو ہر بات ایک پورا انشائیہ بن کر سوجھتی ہے' ان دونوں کے یہاں ڈنرز پر مجھے جمیل ملک' احمد ظفر' سمیع آہوجہ' اعجاز راہی' مرزا حامد بیگ اور سجاد شیخ سے پھر سے ملنے کا موقع ملا' یہ سبھی نام اردو ادب کے معروف ناموں میں ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ ان کے درمیان مختلف موضوعات پر ایک دوسرے سے سخت اختلافات ہوں لیکن ان میں ادب کے لئے یکساں محبت ہے جو انہیں ایک دوسرے سے جوڑے ہوئے ہے۔ بے شک ادیبوں کے ادبی محاسن کا سب سے اچھا تعین ان کی تصانیف ہی سے کیا جاتا ہے لیکن انہیں ان کے شخصی رویوں سے پرکھنا بھی بعض اوقات بہت بھلا لگتا ہے۔ اگر ہمیں کسی ادیب کو ایک فرد کی حیثیت سے بھی جاننے کا موقع ملتا رہے تو ہمیں ان کی اس تحریروں کی چاپ سنائی دینے لگتی ہے جو ابھی غیر نوشتہ ہیں اور اسے اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہیں۔"

(''پاکستان کی یاترا'' از جوگندر پال۔ اوراق' لاہور)

''ہنوز دلی دور است'' اس کہاوت کی صداقت کو آزمانے کے لئے میں نے اور شکیل اعجاز صاحب نے رخت سفر باندھا اور بھساول سے دلی کے لئے بدقسمتی کا ریزرویشن کرالیا کہ

لمبا سفر ہے کٹتے کٹتے کٹے گا۔ اکولہ سے بھساول تک کا سفر تو اٹھتے بیٹھتے گزر گیا اب ہم بھساول اسٹیشن پر جہلم ایکسپریس کا انتظار کر رہے تھے اس قدر شدت سے کہ جیسے ہارا ہوا جواری تین اکوں کا انتظار کرتا ہے۔ چند لمحے گزرے تھے کہ پلیٹ فارم نمبر 4 کے مسافروں میں ہلچل مچ گئی۔ کوئی سنسکرت کے شلوک پڑھنے کے سے انداز میں اپنی ادھوری بات پوری کر رہا تھا۔ کوئی اپنا ٹکٹ جیبِ خاص میں منتقل کر رہا تھا' کوئی کثیر الاولاد بچوں کی گردانی میں معروف تھا۔ جہلم ایکسپریس ایک شانِ بے نیازی سے رینگتی ہوئی آئی اور پلیٹ فارم سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ ہم ریزویشن کے ڈبے میں داخل ہوئے۔ میں نے اطمینان کی سانس لی کہ دوبارہ دلی پہنچ کر ہی یہ ساعت نصیب ہونے والی تھی۔ ٹرین میں چور اچکوں کا ڈر میرے ذہن پر مسلط ہو جاتا ہے اور دوران سفر نیند میری آنکھوں سے ایسے اڑ جاتی ہے جیسے کسی کے ہاتھوں سے توتے اڑ جاتے ہیں۔ میرے مسلسل جاگتے رہنے کی وجہ سے چور اچکوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ دوسرے مسافر مجھ پر شک کرنے لگتے ہیں اور وہ اپنا کام کر چکتے ہیں۔"

("الف سے قطب مینار" از شیخ رحمٰن اکولوی۔ "کتاب نما" دہلی)

"ہم بحرین پہنچے تو شام کے سات بج رہے تھے۔ گہرا سانولا رنگ پکڑتی شام میں سیاہ چٹانیں اور اونچے ہی اونچے ہوتے' سامنے دور دائیں بائیں کے تینوں پہاڑ ایک ہی رنگ میں رنگے اور ایک ہی طرح کی گمبھیر افسردگی لئے ہوئے تھے۔ دریائے سوات غل مچائے جا رہا تھا' مسلسل' متواتر...... کبھی نہ تھمنے والا...... میں سڑک کے کنارے چٹانوں اور پہاڑوں کی طرح گمبھیر افسردگی میں لپٹا سامان کی رکھوالی کے لئے کھڑا تھا۔ اور میرا ساتھی سامنے جگمگ جگمگ کرتے چار منزلہ ہوٹل میں کمرہ لینے گیا تھا' کھوکھا نما دکانوں کی تیز روشنیوں میں ادھر ادھر تھکے ہوئے اداس چہروں اور شوخ قباؤں والی عورتیں گتے کے ڈبوں میں بغور کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ اتنی دور آ کر شاید کسی مسکراہٹ کے کھوج میں تھیں کہ اگر مول مل سکے تو چہروں پر سجا لیں۔ خوشحالی اور گہری اداسی کو یوں بہم یکجا دیکھ کر آج بھی ایک بار میرا دل ڈوب سا گیا۔ ہاتھ میں چھلبا پکڑے' ننگے پاؤں دوڑتے آتے لڑکے نے سڑک کے وسط میں میرے برابر پہنچ کر ایک کراری آواز لگائی "چار روٹی' آدھ سیر گوشت" دوکاندار نے آگ تیز کرنے کے لئے پنکھا جھلاتے ہوئے وہیں سے بیٹھے بیٹھے پشتو میں ایک بوچھار ماری جس میں میری سمجھ میں صرف "پخ پلے" آیا۔ میں نے زیر لب دہرایا۔ "پخ پلے" اور مسکرا دیا۔ مجھے نہ صرف اس لفظ کا ترنم پسند آیا بلکہ اس کی آواز محبوب کی پھبتی اڑاتی ہوئی پیار کی بات۔ کہ معنی دیتی ہوئی سی معلوم ہوئی۔ یوں سمجھے جیسے آپ جیا سے متی جاتی کسی حسینہ سے کہیں کہ جی چاہتا ہے

تمہارے شرم سے سرخ ہوتے اس چہرے کے بخ پلے کر لوں یا میں تم پر بخ پلے ہو جاؤں یا آؤ زندگی میں دونوں مل کر بخ پلے کریں یا اسی طرح کی کوئی اور بات۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کے معنی ہیں از خود۔ خدا معلوم دوکاندار کس ضمن میں استعمال کر رہا تھا۔ لڑکا پلٹا اور اسی رفتار سے دوڑتا ہوا ایک گلی میں گھوم گیا۔"

("دریائے سوات" از اکرام اللہ 'فنون' لاہور)

ڈاکٹر صغرا مہدی کا "مشاہدات ابنِ بطوطی" (برطانیہ کا سفر نامہ) بھی کتابی صورت میں آنے سے قبل 'کتاب نما' دہلی (84-1983) میں شائع ہوا تھا۔

اس سفر نامے کی سب سے بڑی خوبی اس کی ادبیت ہے۔ ڈاکٹر صغرا مہدی لندن میں بھی علمی اور ادبی محفلوں کی خواہش رکھتی ہیں۔ سیاست سے انہیں دلچسپی نہیں، عام عورتوں کی دلچسپیاں ان میں مفقود۔ لہذا ڈھونڈ ڈھانڈ کر لندن کے اردو مرکز پہنچ جائیں گی اور بات کریں گی غالب اکیڈمی اور ایوانِ غالب کی۔ یہی سبب ہے کہ اُدباء کے حلقوں میں ان کا یہ سفر نامہ دلچسپی سے پڑھا گیا۔ نمونہ تحریر ملاحظہ ہو:

"...... سکندر نے اس دن کہیں سے موٹر مانگی۔ پہلے ہم لوگ کنیڈین امبیسی گئے جو ہائڈپار کورنر کے قرب و جوار میں ہے۔ وہاں سے ہم نے لندن کا ایک چکر لگایا اور پھر مادام ٹو ساڈ کے میوزیم گئے جو دوبارہ دیکھ کر اور بھی اچھا لگا۔ ایک ٹورسٹ خاتون نے گاندھی جی کے مجسمے کے ساتھ ہم "ساری پوش" ہندوستانی خواتین کی تصاویر لیں۔ آصف بھی اپنی فوٹو گرافی کی مشق کرتے رہے۔ ہورآف چیمبر کو چھوڑ کر باہر نکلے تو ایک خاتون نے ایک پوسٹر تھمایا، جس میں ایک سولی کسی سر کی منتظر تھی۔ ہم نے اپنے سر پیش کئے، چند منٹ میں ایک ایک پونڈ لے کر انھوں نے دو پوسٹر ہم دونوں کو تھما دیئے جن میں ہمارے سر سولی پر ٹنگے تھے اور اوپر لکھا تھا "I Lost my head in London"۔ ممانی جان پہلے بھونچکا اور پھر محظوظ ہوئیں۔

دس جون کی شام ہم لوگوں نے لندن میں بسنے والے ہندوستانی اور پاکستانی ادیبوں کے ساتھ گزاری۔ کہانیاں سنیں اور سنائیں اور بہت پر لطف محفل رہی۔"

("کتاب نما" دہلی جنوری 1984ء)

ڈاکٹر صغرا مہدی کا دوسرا سفر نامہ پاکستان سے متعلق ہے جس کا عنوان ہے "ذرا ہمیں پڑوس میں"۔ یہ سفر نامہ بھی پہلے پہل 'کتاب نما' دہلی 1985ء میں شائع ہوا۔ اس سفر نامے میں بھی ڈاکٹر صاحبہ کی یہی کوشش رہی کہ پاکستان کے علمی و ادبی حلقوں کی خیر خبر

اردو دنیا تک پہنچا سکیں۔ ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو :

"صبح "جنگ" پڑھا تو معلوم ہوا کہ پاکستانی قلم کاروں کی کانفرنس اسلام آباد ہوٹل میں ہو رہی ہے' جو ہمارے بہت قریب تھا اور صدر ضیاء اس کا افتتاح کر رہے تھے۔ مشہور مزاح نگار شفیق الرحمان اس کے کرتا دھرتا تھے۔ ہمارے بھانجے نصرت عباس نے اپنے ذرائع استعمال کر کے ہمارے لئے دعوت نامہ حاصل کرنے کی کوشش کی مگر معلوم ہوا کہ سیکورٹی کے اقدامات سخت ہیں "I" کارڈ دکھانا ہوتا ہے۔ پہلے سے نام فہرست میں نہیں ہے مگر ہم نے ٹیلی وژن کے وسیلے سے اس کانفرنس میں شرکت کر لی' گھر بیٹھے۔ پاکستان کے ادیبوں اور نقادوں کو دیکھا۔ احمد ندیم قاسمی' وزیر آغا' جمیل جالبی' جمیل الدین عالی اور شفیق الرحمان' جن کی چیزیں لڑکپن سے پڑھتے آئے تھے' جن کے کرداروں شیطان' روفی اور حکومت آپا سے گہری شناسائی تھی۔"

("کتاب نما" دہلی' نومبر 1985ء)

"یورپ کے تمام مشروبات سے واقفیت کا دعوئ تو شاید وہ لوگ بھی نہ کر سکیں جن کے قالبوں میں عمر خیام' غالب یا ڈلن تھامس جیسی روحیں ہوتی ہیں۔ پھر اس عالم میں میرے جیسا تصنع نوش کمپاری سے لاعلم تھا تو "خواندہ" لوگ مجھ سے ضرور صرفِ نظر کریں گے کہ ان کی عالی ظرفی سے یہی امید ہے۔ خواندہ کی اصطلاح میری اپنی ایجاد نہیں ہے۔ میں نے یہ اسم صفت گوجرانوالہ کے میاں شفیع مرحوم سے سن رکھا تھا جو آج میرے کام آیا۔ لکھاریوں کو اپنے ہاں مہمان کر کے میاں صاحب کہا کرتے تھے۔ ناخواندہ لوگ جہاں جی چاہے بیٹھ جائیں اور خواندہ (پینے والے) ادھر میرے پاس آجائیں" پھر بھنچی ہوئی مجلس کے دوران اگر کوئی نووارد حجرۂ خواندگان میں آنکلتا تو میاں صاحب ہم نشینوں سے پوچھا کرتے یہ بھی خواندہ ہے یا غلطی سے ادھر آنکلا ہے ؟"

جب ایئر ہوسٹس دوسرے راؤنڈ پر لڈو ونڈدی گلی دے وچوں نکلی تو میرے سامنے سوڈے کی ایک بوتل اور ایک گلاس میں سرخ رنگ کا کوئی مشروب رکھ گئی۔ گلاس کے کنارے پر لیموں کی ایک قاش بھی اڑسی ہوئی تھی۔ ساتھ چند دانے نمکین مونگ پھلی کے بھی تھے اس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ میں مونگ پھلی کے دیس کو عازمِ سفر تھا۔ اللہ نے امریکہ کو مونگ پھلی دی اور امریکہ اسے ساری دنیا کو دے رہا ہے۔ یہ مونگ پھلی لینے والے کے گلے کا طوق بن جاتی ہے جسے وہ نسل در نسل نہیں اتار سکتا۔"

("لندن کہ ایک شہر تھا" از حسین شاہد۔ "فنون" لاہور)

"ٹیوب ٹرین میں بیٹھے بیٹھے مختلف اسٹیشنوں کو لمحوں کی طرح اپنے پیچھے بھاگتا دیکھ رہا تھا اور میرے سامنے خدائے بزرگ و برتر کی مخلوق بھاگ رہی تھی۔ چھوٹے بڑے، بچے بوڑھے، عورت مرد، کمزور و توانا، کالے گورے، مشرقی مغربی غرض کون ذی روح تھا کہ جس کے پاؤں میں بجلی کی کلیں نہ لگیں ہوں۔ عورتیں ہاتھوں میں تھیلے اور بٹوے لئے، مرد بریف کیس پکڑے، بوڑھے مرد چھڑیاں دبائے ایک دوسرے کے پیچھے قطار اندر قطار، درانبوہ نامعلوم منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ ہر ایک کی آنکھوں سے اخبار لگا ہوا لیکن اس کے باوجود دھیان اسٹیشن کی طرف اور میرا دھیان زہری کی اس متوقع سی بے اختیار ہنسی کی طرف تھا جس کو برسوں سے سن رہا ہوں۔ میں سوچتا جلد یا بدیر زہری ہنسے گی اور کہے گی بھائی جان غلط آگئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم ایک جگہ اتر گئے۔ اسٹیشن کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے سڑک پر آئے تو زہرہ نے مجھے برٹش میوزیم کا راستہ بتایا اور اپنے اسکول واقع فیفر لین تک لے گئی۔ طے یہ پایا کہ ہم دونوں ساڑھے تین بجے سہ پہر اس ہی نکڑ پر ملیں گے اور یہاں سے میں برٹش میوزیم کی طرف چل دیا۔"

("گرد راہ" از پرتو روہیلہ۔ "اوراق" لاہور)

یہ تو تھے مختصر سفر ناموں میں سے چند اقتباسات۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے مختصر سفر نامے لکھے گئے۔ خاص طور پر ڈاکٹر وحید قریشی کا "چین کی حقیقتیں اور افسانے" (اردو ڈائجسٹ، لاہور) اختر امان کا "جزیرہ" (نوائے وقت)، جاوید اقبال کارٹونسٹ کا "سفر نامۂ یورپ" (نوائے وقت)، ڈاکٹر اعجاز راہی کا "راستے میں شام" (فنون، لاہور) بلراج کومل کا "جزیروں کی سرگوشیاں" (اردو زبان، سرگودھا) حمید احمد خان کا "میری بھارت یاترا" (ادبی دنیا، لاہور) جوہر کرنالی کا "سفر ہے شرط" (نوائے وقت) عبدالحمید اعظمی کا سفر نامہ امریکہ "ساحل کی سوغات" کے عنوان سے "فنکار" لاہور 1984ء بلدیو مرزا کا ڈائری کے انداز میں لکھا گیا یوگوسلادیہ کا سفر نامہ "سترو گا کا عالمی جشنِ شاعری" کے عنوان سے اوراق لاہور مارچ۔ اپریل 1984ء ریحانہ سلیم کا "سفر نامہ جرمنی" (اردو ڈائجسٹ، لاہور) محمد خالد اختر کا "دو سفر" ("فنون" لاہور) حمیدہ جبیں کا "جلاوطن" "تخلیق" لاہور، نوشابہ نرگس کا "سفر نامہ امریکہ" روزنامہ "امروز" لاہور، ہارون رشید کا سفر نامہ امریکہ بہ عنوان "سی اٹ فالنگ" "سویرا" بر منگھم بابت، فروری 1984ء سلمٰی یاسمین نجمی کا "کوئے ملامت" یعنی سفر نامہ لندن "اردو پنچ" راول پنڈی، بلقیس ظفر کا "مسافتیں کیسی" روزنامہ "جنگ" راول پنڈی اور کارٹونسٹ جاوید اقبال کا سفر نامۂ امریکہ "کلنٹن کے دیس میں" روزنامہ "جنگ" راول

پنڈی بابت 1997ء میں شائع ہوئے۔ آخر الذکر سفر نامہ کارٹونوں اور کیری کیچرز سے مزین ہے اور تا حال مختصر سفر ناموں کی آخری مثال۔

اب تک زیر بحث نہ لائے جا سکے دیگر سفر ناموں میں رام لعل کا "زرد پتوں کی بہار" کیول دھیر کا "خوشبو کا سفر" پر تورو ہیلہ کے سفر نامے "گرد کارواں" اور "سفر گشت" گوپی ناتھ کا "سفر آشنا" فخر زمان کا "گردش میں پاؤں" کرنل محمد خاں کا "بسلامت روی" محمد خالد اختر کے دو سفر نامے "دو سفر" اور "سیاہ پھوڑا" جلال الدین صدیقی کا "زیتون کے سائے" فردوس حیدر کے دو سفر نامے "دائروں میں دائرے" اور "یہ دوریاں یہ فاصلے" محمود شام کا "کتنا دور کتنا قریب" ڈاکٹر ریاض احمد ریاض کا "بر سبیل تذکرہ" شین فرخ کے دو سفر نامے "نئی دنیا پرانی دنیا" اور "لواگون" بلراج کومل کا "جزیروں کی سرگوشیاں" ہرچرن چاولہ کا "تم کو دیکھیں" جمیل زبیری کے تین سفر نامے "مکران" "موسموں کا عکس" اور دھوپ کنارا" غلام الثقلین نقوی کے دو سفر نامے "چل بلیا اگلے شہر" اور "اک طرفہ تماشا" ڈاکٹر ظہور اعوان کے دو سفر نامے "دیکھ کبیرا رویا" اور امریکہ نامہ" حکیم محمد سعید کے پانچ سفر نامے "یورپ نامہ" (دو جلدیں) "کوریا کہانی" "ایک مسافر چار ملک" "جرمنی نامہ" اور "ماہ روز" محسن بھوپالی کا "حیرتوں کی سرزمین" سید وجاہت حسین کے چار سفر نامے "لندن کی سڑکیں سونے کی ہیں" اور "جب میں نے شاہ کا ایران دیکھا" "جب میں نے لینن کا روس دیکھا" "جب میں نے کویت دیکھا" شیخ منظور الٰہی کا "مانوس اجنبی" عرفان علی کا "قدم بہ قدم" اسلم کمال کے دو سفر نامے "اسلم کمال اوسلو میں" اور "لاہور سے چین تک" رضوان صدیقی کے تین سفر نامے "ایک گاؤں کی کہانی" "آستانے سے پیرس تک" اور "روشن اندھیرے" ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا "دید و باز دید" رفیق ڈوگر کا "اے آب رود گنگا" ظفر الحسن کا "وہ قربتیں سی فاصلے سے" جگن ناتھ آزاد کا "پشکن کے دیس میں" محمد حمزہ فاروقی کے تین سفر نامے "زماں و مکاں اور بھی ہیں" "آج بھی اس دیس میں" اور "سفر آشوب" داؤد طاہر کے دو سفر نامے "سفر زندگی ہے" اور "شوق ہم سفر میرا" مسعود سلطان لکھیسر کا "گوشۂ وطن بریں" اختر موٹکا کا "پیرس 205 کلو میٹر" بشریٰ رحمٰن کے دو سفر نامے "براہ راست" اور ٹک ٹک دیدم" پروین عاطف کے دو سفر نامے "کرن، تتلی، بگولے" اور "خوابوں کے جزیرے" حسن رضوی کے "دیکھا ہندوستان" اور "چینیوں کے چین میں" ریحان اظہر کا "ہائے امریکہ، بائے امریکہ" ڈاکٹر عبد السلام خورشید کا "رو میں ہے رخش عمر" ڈاکٹر اجمل نیازی کا "مندر میں محراب" آغا امیر حسین کا "آلِ محمدؐ کا مہمان" صابر آفاقی کا "کثرت نظارہ" اور

سجاول خان رانجھا کا "گھر کی تلاش" شامل ہیں۔ ان میں سے چند ایک کے اقتباسات دیکھیے :

"ہوسٹیس دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ارضی و سماوی۔ ارضی یعنی گراؤنڈ ہوسٹیس نمازی شکل و صورت کی ہوتی ہیں۔ یعنی نماز پڑھیں نہ پڑھیں، پرہیز گار لگتی ہیں۔ ان سے بات کرتے ہوئے دل نیکی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ دنیا فانی معلوم ہوتی ہے اور ان کی صحبت میں ہوائی جہاز کی جائے نزدیک ترین مسجد کو بھاگ جانے کو جی چاہتا ہے۔ سماوی ہوسٹسیں جہاز پر پائی جاتی ہیں اور ان کی تاثیر بالکل مختلف ہوتی ہے۔ ان کی ہمسفری سے یادِ الٰہی میں تو نمایاں کمی آجاتی ہے، البتہ ان کے قرب سے تولیدِ خون میں معتدبہ اضافہ ہوتا ہے اور ان کی معطر سانسوں کے طفیل، ہوائی جہاز کی ائرکنڈیشننگ کے باوجود، زندگی میں حرارت آتی ہے۔ اور یہ چلتی پھرتی رہیں تو دنیا رہنے کے قابل معلوم ہوتی ہے۔ ان کی مہمان نوازی اوڈی کلون میں گھل کر جہاز کی فضا کو قطعی طور پر ایمان ربا بنا دیتی ہے، جس سے مسافروں اور مسافرات کے اپنے اپنے ارمان اور رومان تحت الشعور میں کروٹ لے کر اچانک جاگ اٹھتے ہیں حتیٰ کہ بوڑھے اور بھاری بھر کم سینئر افسر بھی جو ریٹائرمنٹ کے دہانے پر کھڑے ہو کر آخری سرکاری دورے پر نکلے ہوتے ہیں، بار بار گھنٹی کا بٹن دباتے ہیں اور بار بار سنگتریاں طلب کرتے ہیں اور اس بہانے اپنی ہلکی پھلکی میزبانوں سے خوش وقت ہو کر اپنی ہم عمر اور ہم وزن بیگمات سے تیس ہزار فٹ کی بلندی پر وقفہ نجات مناتے ہیں۔ الغرض ارضی و سماوی ہوسٹسوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

آخر ہم نے دولتِ ایمان سے مالا مال ہو کر اس خدا رسیدہ ارضی ہوسٹس سے رخصت لی اور اس توقع پر زینے پر قدم رکھا کہ رنگ و بو کی آسمانی دنیا میں داخل ہوتے ہی شاید کوئی فتنہ ساماں سماوی میزبانہ ہمارے ایمان کے امتحان پر آمادہ ہو جائے لیکن دروازے پر کھڑی ائر ہوسٹس کو دیکھا تو خلافِ توقع موصوفہ میں کوئی ممتحنوں والی بات نظر نہ آئی۔ ہر چند کہ آپ کے رخ و گیسو پر پی آئی اے کی مفت کریموں اور لوڈی کلونوں کا فیاضانہ چھڑکاؤ کیا گیا تھا، تاہم وہ بات پیدا نہ ہو سکتی تھی جو سماوی مہ سیماؤں کا خاصہ ہوتی ہے۔ بلکہ شکل و صورت سے آپ اپنی اس ارضی بہن سے بھی زیادہ تہجد گزار نظر آئیں جس کی تحویل سے ہم ابھی ابھی آزاد ہوئے تھے۔"

("سلامت روی" از کرنل محمد خان)

"ایک خوبصورت لڑکی نے دروازہ کھولتے ہی ہمیں دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کیا اور دلنواز مسکراہٹ سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ باہر کی تیز روشنی سے نیم تاریک ہال میں داخل

ہوتے ہی ہماری آنکھیں کچھ دیکھ نہ پائیں۔ لڑکی نے میرا ہاتھ پکڑ کر صوفہ سیٹ پر بٹھایا جب تک ہماری آنکھیں نیم تاریک ماحول سے مانوس ہو گئیں۔

اس ہال کی دیواریں خوبصورت نقش و نگار سے مزین تھیں اور عین وسط میں ڈانس فلور تھا جس پر کئی جوڑے دھیرے دھیرے ڈانس کرتے ہوئے ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے۔

"یہ کیسا مساج ہاؤس ہے؟" میں نے آنکھیں پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا تم سمجھتی تھیں کہ اندر داخل ہوتے ہی ایک تالاب ملے گا جس کے کنارے لڑکیاں بیٹھی مردوں کی مالش کر رہی ہوں گی۔"

نوائے کے استفسار پر میں جھینپ کے رہ گئی۔ واقعی میرے ذہن میں کچھ اسی قسم کا نقشہ تھا۔ میرا خیال تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی اوندھے سیدھے پڑے ہوئے لوگ مالش کراتے ہوئے نظر آئیں گے۔ شاید میرے ذہن میں ابھی تک پنجاب میں گزارے ہوئے دنوں کا نقشہ تھا۔ جب "تیل مالش" کی لمبی تان کے ساتھ میلے کچیلے کپڑے پہنے ہاتھ میں سرسوں کا تیل لئے مالشی چھوکرا گلی کوچوں میں گھومتا ہوا نظر آیا کرتا تھا۔ اس زمانے میں بھی میں مالش کرانے والوں پر حیران ہوا کرتی تھی کہ تیل لگا کر جسم پر الٹے سیدھے زاویے سے ہاتھ چلانے میں کیا راحت ملتی ہوگی۔

"مادام اس مساج ہاؤس میں میری دوست کیم کام کرتی ہے۔ میرا اپنا مساج ہاؤس بھی بالکل ایسا ہی ہے۔ میں سیموئیل کے ساتھ اپنے مساج ہاؤس میں جانا نہیں چاہتی تھی کیونکہ سیموئیل کی دوستی وہاں پہلے ایک اور لڑکی کے ساتھ تھی اب اسے میرے ساتھ دیکھ کر اس لڑکی کے جذبات مجروح ہوتے۔"

"گویا تم نے اس لڑکی سے سیموئیل کو ہتھیا لیا۔" میرے لہجے کا طنز اس نے محسوس کیا۔

"مادام یہ تو زندگی کا اصول ہے۔ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلیوں کا کھا جاتی ہے۔ ہم اگر دوسروں کے حق میں دستبردار ہوتے رہیں، تو بھوکے مر جائیں۔"

(دائروں میں دائرے "تھائی لینڈ کا سفرنامہ : طبع اول 1980ء از فردوس حیدر)

"مجھے ستیہ جیت رے کی فلمیں دیکھنی ہیں۔ پاکستان میں نایاب ہیں صرف "پاتھیر پنچالی" "سڑک کا نغمہ" مل سکی تھیں میں نے اپنی اداسی چھپاتے ہوئے موضوع بدلا۔

"ستیہ جیت رے کے خیال میں فلمیں بنانے کا مقصد روپے کمانا نہیں تھا بلکہ فلموں

کے ذریعے ہندوستانی عوام کی معاشرتی و ثقافتی زندگی، غربت و بے بسی اور جاگیرداروں کے جبر و استحصال کو پیش کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں بین الاقوامی سطح پر بہت مان ملا۔ ان کا شمار دنیا کے دس بہترین فلم ڈائریکٹروں میں ہوتا ہے۔ گو ان کی فلم "اپراجیتو" باکس آفس میں ناکام ہوئی لیکن اس نے سات بین الاقوامی ایوارڈ حاصل کئے۔ اس فلم کی ناکامی سے بددل ہو کر "جلسہ گھر" شروع کی اس میں ناچ اور گانے شامل کئے۔ جب فلم مکمل ہوئی تو وہ نہایت سنجیدہ تھی۔ اسے فرانس میں ایک شاہکار قرار دے دیا گیا۔ "کرشنا نے تفصیل بتائی۔

"کاش ستیہ جیت رے زندہ ہوتے تو میں ان سے مل سکتی" میں نے دکھ سے کہا۔ فن کار زندہ رہتا ہے اور ستیہ جیت رے فلم ساز ہدایت کار، کہانی کار، فوٹوگرافر، سنگیت کار اور مصور تھے۔ وہ کیسے مر سکتے ہیں۔ انہوں نے کل 36 فلمیں بنائیں اور انہیں خصوصی "آسکر ایوارڈ" اور "بھارت رتن" ایوارڈ ملا۔ ان کو اپنی زندگی میں اپنی شناخت کی خوشی میسر آئی۔ میں سوچتی ہوں۔"

("یہ دوریاں یہ فاصلے" بھارت کا سفرنامہ "طبع اول 1996ء از فردوس حیدر)

ڈاکٹر ریاض احمد ریاض کا "بر سبیل سفر" (مطبوعہ 1982ء) لندن اور نیویارک، دو شہروں کا سفرنامہ ہے جو شگفتہ بیانی اور بے پناہ ذوق شعری کے سبب ہمیشہ یاد رہے گا۔ البتہ پنجابی الفاظ کا بے محابہ استعمال کہیں کہیں نظر میں کھٹکتا ہے۔ نمونہ تحریر ملاحظہ ہو :

"لینن سنٹر کی بہت شہرت سنی تھی، رات کے دس بجے ہوں گے کہ میں وہاں بھی پہنچ گیا، خدا معلوم اس میں کتنے ہال ہوں گے اور تھیٹر...... میں فواروں کے حسین رخ سے اس میں داخل ہوا۔ ایک ڈرامے کے اختتام پر تماشائی یہاں فواروں کی چار دیواری کے ارد گرد گپ شپ لگاتے شغل آئس کریم خوری میں مصروف تھے، ایک بات کا ذکر یہاں ضروری ہے کہ اب تک جتنے امریکی مرد و زن نظروں سے گزرے تھے، سب لباس کے بارے میں نفرت انگیز حد تک غیر سنجیدہ تھے لیکن یہاں بغیر کسی استثنا کے لیڈیز اینڈ جنٹس پورے لباس میں تھے اور بے حد خوش پوش، مرد سوٹ پہنے ٹائیاں لگائے عورتیں بھی پورے سکرٹوں میں، چہروں پر امارت کی کہانیاں لئے...... بالکل جیسے گلبدنان امریکہ کو ہونا چاہئے!

ایک کیو میں لگ کر دو ڈالر کی ایک اولمپک مشعل نما آئس کریم کی ٹارچ، میں نے بھی تھام لی اور پھر سوائے اس کے کوئی تمنا نہیں تھی کہ جلد از جلد گھر پہنچ جاؤں، ایک تو رات زیادہ ہوتی جا رہی تھی، دوسرے یہ کہ تلووں کا درد بڑھ کر گٹوں سے ہوتا ہوا گوڈوں تک آ گیا تھا اور ایک قدم چلنا دوبھر!

ایک دلنواز سے چرچ ایونیو وکلین مکا راستہ دریافت کیا' اس نے پہلے حیرت کی' پھر ہدایت کہ اول تو اتنی رات گئے زیر زمین ریلوے سے نا جاؤ' اور اگر تمہیں یہی راستہ سوٹ کرتا ہے تو پھر فوراً روانہ ہونے کی سوچو...... "جگمگاتے نیویارک کا یہ پہلو کس قدر تاریک ہے!

بات اس دلربا کی سو فیصد درست نکلی' سب وے سٹاپ پر اکا دکا آدمی تھے' ایک لمحے کے لئے طبیعت پر ذرا بار سا پڑا' لیکن جلد ہی مطلوبہ گاڑی آ گئی اور قابلِ ذکر یہ کیفیت تھی کہ اس کے دو تین کمپارٹمنٹ تو لبالب بھرے ہوئے تھے جب کہ باقی ساری ٹرین خالی پڑی تھی' جو بھی آتا یا آتی دوسرے ڈبوں میں آرام سے بیٹھنے یا لیٹنے کی جائے ان محفوظ کمروں میں کھڑے ہونے کو ترجیح دیتا' چاہے دم گھٹ جائے!

اپنے سٹاپ پر نازل ہوئے تو رات نصف کے قریب پہنچ رہی تھی' اسی ایونیو چرچ پر جہاں دن کے وقت ہزاروں بندگانِ خدا اترتے چڑھتے تھے' اب ویران پڑا تھا' ٹکٹ دینے والے بابو یا بیبیاں تک غائب تھے' صرف بے خوف مشینیں پڑی تھیں کہ ٹوکن ڈال ٹیوب میں جا بیٹھو۔ باہر کا رخ کیا تو دو اور بھارو' اس خاکسار سے آگے رواں تھے' شکلوں سے اچکے معلوم ہوئے' ایک نشئی کے ہاتھ میں کسی ڈریکولا قسم کی خوفناک فلم کے بڑے بڑے پوسٹر تھے' خدا معلوم وہ انہیں کھلے منہ کیوں لئے جا رہا تھا وہ تو شکر ہے کہ تحت الوئی سے باہر آتے ہی وہ پہلے ہی موڑ پر مڑ گئے...... اور سامنے کی سڑک جس کی پیمائش آج رات میری قسمت میں لکھی تھی کا احوال یہ تھا کہ دور دور تک آدم نہ آدم زاد' اور مجھے کم از کم اس پر آدھ میل چل کر ایک موڑ سے دور تین فرلانگ اور طے کرنا تھے۔

میں چل تو پڑا...... لیکن میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے اس رات 'خوف کا عرفان' حاصل ہوا' سارے اچھے مناظر کسی پاتال میں غرق ہو گئے' اپنی ذات کے سوا کسی کا احساس نہ رہا' خواہشوں کی گزری بد نمائیاں کئی گنا ہو کر ذہن کی سکرین پر فلیش بیک دینے لگیں' یقین سا ہو گیا کہ آج خیر نہیں...... لعنت اس مردود ترقی پر' دنیا کے اس روشن ترین' دل چسپ ترین' عجیب ترین شہر میں کوئی اتنا تنہا ترین بھی ہو سکتا ہے!...... یہاں آنے سے پہلے میں اس کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا!"

(بر سبیل تذکرہ" طبع اول 1982ء ڈاکٹر ریاض احمد ریاض)

پاکستان ٹیلی وژن کے نامور اداکار ریحان اظہر کا سفرنامہ امریکہ "ہائے امریکہ' بائے امریکہ" (طبع اول جنوری 1992ء) اس اعتبار سے ایک اہم سفرنامہ ہے کہ ایک جینوئن فنکار مغرب کو مشرقی آنکھ سے کس طور دیکھتا ہے اور خدا جھوٹ نہ بلوائے ایک اداکار کا تحریر کردہ یہ

سفر نامہ ہمارے بہت سے بہ زعم خود شعراء اور ادباء کے سفر ناموں پر بھاری ہے۔ مواد کے اعتبار سے بھی اور طرز تحریر کے اعتبار سے بھی۔ واضح رہے کہ یہ سفر نامہ بھی بہت عمدہ کارٹونوں سے مزین ہے۔ ایک سو اٹھائیس صفحات پر مشتمل اس سفر نامے میں "امریکہ میں لکشمی چوک یاد آگیا" اور "خواب کو خیال سے معاملہ" جیسے شاہکار ابواب ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

اب ملاحظہ ہو شین۔ فرخ کے سفر نامے "آواگون" سے اقتباس :۔

"نارمن ایک کم سن لیکن زور دار اسکاٹی تھا۔ اپنی ماں کے ساتھ ایسٹر کی چھٹیاں گزارنے لندن گیا تھا۔ وہ خالص اسکائی رنگ میں بات کرتے ہوئے اپنی کیوب کے ساتھ کھیلتا رہا۔ کہنے لگا۔ "کچھ لوگ ایڈنبرا کو ایڈنبرگ پڑھتے ہیں" پھر وہ ہنسا۔ "کتنے احمق ہیں۔" وہ اپنی بہن کی شکایتیں لگا رہا تھا (وہ کیوب کے رنگ مسلسل بناتا بگاڑتا رہا)۔ "میری بہن ایبرڈین (شمالی اسکاٹ لینڈ کا ایک مقام) میں نرس ہے۔ ویک اینڈ پر گھر آتی ہے۔ کوئی کام نہیں کرتی۔ اپنے کمرے میں گھسی میوزک سنتی رہتی ہے۔ اس کے کمرے میں کپڑے بکھرے رہتے ہیں اور وہ جاتی ہے تو ممی اس کا کمرہ صاف کرتی ہے۔ وہاں چوکلیٹ اور چپس کی خالی تھیلیوں کی بھرمار ہوتی ہے۔"

ہمارا سفر جاری تھا۔ یکدم نارمن عجلت میں پچھلی نشست کی طرف گیا۔ ماں سے تاش لے آیا۔ اور کہنے لگا "ہم سرحد پار کر چکے ہیں۔ اب ہم اسکاٹ لینڈ میں ہیں" اس کے چھوٹے سے وجود میں کتنا بڑا اسکائی تھا۔ جس کا ذہن اسکاٹ لینڈ کو متحدہ بادشاہت کے ایک حصے کے طور پر تسلیم کرنے سے انکار کرتا تھا۔ ایڈنبرا کا رہنے والا اور رابرٹ برنز کے نغمے گانے والے نارمن کے دل میں شاید اب اسکاٹ لینڈ کے مقبول نغمے کے سوتے پھوٹنے لگے تھے۔"

("آواگون" از شین فرخ)

شین فرخ کا دوسرا سفر نامہ "نئی دنیا پرانی دنیا" (مطبوعہ 1979ء) بھی اسکاٹ لینڈ سے متعلق سفر نامے "آواگون" کی طرح نئے منطقوں اور تہذیبی مطالعوں کے باوجود افسانہ طرازی سے جاملا' جیسے کرنل محمد خان کا "بسلامت روی" متعدد جگہوں پر مزاح نگاری کے سپرد ہو گیا یا افضل پرویز کا "مسافر نواز بہتیرے (مطبوعہ "جنگ" راولپنڈی 84-1983ء) اخباری رپورٹنگ سے جاملا۔ یا اختر ممونکا کے سفر نامہ "پیرس 205 کلومیٹر" (مطبوعہ 1982ء) کا پیرائیہ بیان انتہائی دلکش ہونے کے باوجود سفر نامے کے بیشتر حصے "ویوکارڈز"

کی فراہم کردہ معلومات کو بنیاد بنا کر لکھے گئے معلوم ہوتے ہیں۔اب جمیل زبیری کے سفر ناموں سے اقتباسات دیکھئے:

''تو صاحبو!اب واپسی 'لیکن راستے میں منگ بادشاہوں کے زیرزمین مقابر بھی دیکھتے چلو۔یہ مقبرے کہ زمین کی سطح سے چالیس پچاس گز نیچے ہوں گے۔غالباً اس لئے زیرزمین بنائے گئے کہ بعد کے آنے والوں کی تاخت و تاراج سے محفوظ رہیں۔منگ وہ چینی خاندان تھا جس نے چنگیز خان کے وارثوں سے سلطنت چھینی اور عہد اس کا 1368ء سے 1644ء تک ہے۔یوں کہئے کہ مقبروں والے یہ بادشاہ اکبر اعظم کے ہم زمانہ تھے۔صدیوں یہ مقبرے دنیا کی نظروں سے پنہاں رہے۔یہ غالباً پچھلی صدی کی بات ہے کہ تجسس کرنے والوں کو ایک لوح ملی جس میں ان کے راستے کی سمت مرموز تھی۔برسوں کی کھدائی کے بعد ایک دروازہ تیغہ کیا ملا۔اندر اترے تو بند ایوانوں میں مقبروں کے علاوہ بڑے بڑے چینی کے ظروف میں انواع واقسام کی نعمتیں موجود پائیں۔سونے چاندی اور جواہر کے ڈھیر لگے تھے۔چوبی تابوت تو سیلن اور موسمی اثرات سے خستہ و خراب ہو کر مٹی ہو چلے تھے اور بعد میں دوبارہ انہی نقشوں پر بنوائے گئے لیکن باقی چیزیں سلامت تھیں۔سیڑھیاں اترنے کے بعد دروازوں کو کھولنا آسان نہ تھا۔جن لوگوں نے دروازے بند کئے۔انہوں نے اندر کی بلیاں گرا کر ایسا انتظام کیا تھا کہ کوئی باہر سے نہ کھول سکے لیکن دانشمندوں نے یہ گرہ بھی کھول ہی لی۔عجیب آسیبی ماحول ہے اوپر ستر اسی فٹ اونچی چھت ہے' نیچے غلام گردشیں اور طاقچے۔ایک بڑے ظرف میں قربان گاہ کی بتیوں کے لئے تیل بھرا تھا' اب بھی موجود ہے لیکن بہت گاڑھا ہو گیا ہے۔اتنے میں ہمارے چینی دوستوں نے کہا کہ ایک چیز اور رہ گئی ہے' ادھر آؤ۔

ایک بہت بوسیدہ چار پانچ سو برس پہلے کا چوبی دروازہ جھک کر پار کیا تو اندر پہنچ کر سب آنکھیں جھپکنے لگے۔تو کیا منگ زمانے میں ہماری طرح کے صوفے کرسیاں اور میز بھی ہوتے تھے۔میزبان مسکرائے۔اس دور کے اس بغلی کمرے کو مہمانوں کی نشست کے لئے درست کر لیا گیا تھا فقط دروازہ عہد قدیم کا باقی رکھا تھا۔سب بیٹھے' چائے آئی اور سب اپنی حیرانی پر ہنسے۔

معلوم ہوا کہ ابھی ایک دو مقبرے کھولے گئے ہیں نشاندہی سترہ اٹھارہ کی ہو چکی ہے۔جو ان نواحات میں میلوں تک نصف دائرے کی شکل میں پھیلے ہوئے ہیں۔''

(''مکران'' طبع اول اکتوبر 1987ء از جمیل زبیری)

''واپسی میں غالب کی قبر پر گیا جو خواجہ کے مزار اور غالب اکیڈمی کے درمیان

واقع ہے۔ اس قبر کو سب سے پہلے ہندوستان کی فلمی دنیا کے مشہور ایکٹر سہراب مودی نے دریافت کر کے سنگ مرمر کا بنوا دیا تھا۔ شاید اس لئے نہیں کہ وہ غالب کا ایک عظیم الشان شاعر کی حیثیت سے شایان شان مقبرہ بنانا چاہتا تھا بلکہ صرف اس لئے کہ اسے اپنی ایک فلم میں غالب کی قبر دکھانا تھی۔ بہر حال ہمیں اور آنے والی نسلوں کو سہراب مودی کا ممنون ہونا چاہئے ورنہ ممکن تھا کہ آج غالب جیسی ہستی کی قبر کا نام و نشان بھی باقی نہ ہوتا۔ غالب کے مزار پر جو کتبہ لگا ہوا ہے۔ اس پر ایک رباعی لکھی ہے جس کے آخری مصرعہ سے غالب کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔

کل میں غم و اندوہ میں باخاطر محزوں
تھا تربت استاد پہ بیٹھا ہوا غمناک
دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کی مجروح
ہاتف نے کہا گنج معنی تھی تہ خاک۔ 1285ھ

غالب کی قبر کے جنوب کی طرف اس کے بھتیجے عارف کی قبر بھی ہے یہ وہی عارف ہے جو جوانی میں فوت ہو گیا تھا اور غالب نے اس کا مرثیہ لکھا تھا۔ ان دونوں قبروں کے برابر اب پتھر کا ایک بڑا چبوترہ بنا دیا گیا ہے۔ مگر وہاں بھی بے پناہ گندگی اور غلاظت ہے اور بہت سے بنگالی اور مزدور طبقے کے لوگ آس پاس جھگیوں یا کچے مکانوں میں رہتے ہیں۔ اور یہ لوگ اپنے کپڑے دھو کر غالب کی قبر کی چار دیواری پر سوکھنے کے لئے پھیلا دیتے ہیں۔

غالب کی قبر کے عقب میں مرزا کوکل تاش اور جی جی انگا اور ان کے خاندان کے دیگر افراد کی قبریں ہیں۔ اسے چونسٹھ کھمبا بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ اس عمارت کی لمبی چوڑی چھت چونسٹھ کھمبوں پر تعمیر کی گئی ہے۔ شاید اس علاقے کی دیکھ بھال ہندوستان کا محکمہ آثار قدیمہ بھی نہیں کرتا۔ یہ تمام علاقہ بیرونی علاقے سے بھی زیادہ گندہ ہے۔ گرمی سے بچنے اور آرام کرنے کے لئے اطراف میں رہنے والے لوگ ان قبروں پر بیٹھے یا لیٹے رہتے ہیں۔ تاش کھیلتے ہیں اور ان کے بیچ دیواروں کے سہارے گولیاں کھیلتے ہیں اور وہیں پیشاب بھی کرتے ہیں جس کی وجہ سے پورے علاقے میں تعفن پھیلا رہتا ہے۔ وہاں زیادہ دیر ٹھہرنا اور مختلف قبروں کے کتبے وغیرہ پڑھنا ناممکن تھا اس لئے میں جلد ہی واپس آگیا اور قریب ہی واقع غالب اکیڈمی چلا گیا۔"

("موسموں کا عکس" طبع اول جنوری 1994ء از جمیل زبیری)

حکیم محمد سعید کا "یورپ نامہ" 1960ء دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے جس میں ترکی،

یوگوسلاویہ آسٹریا اور سوئٹزرلینڈ کے حالاتِ سفر تاریخی' جغرافیائی' ثقافتی اور طبّی حقائق کے پیش نظر لکھے گئے۔ لیکن اس سفرنامے میں، تحقیق نے مساعت کی بے راہ روی سے پیدا ہونے والی مسرت و بہجت کو کچھ اس طرح نکیل ڈالی ہے کہ انتہائی دلچسپ اور رواں مناظر یک لخت ساکت ہو جاتے ہیں اور صفحوں کے صفحے تحقیق سے متاثر ہو کر سفرنامے کو تحقیق یا تاریخ کی کتاب بنا دیتے ہیں۔

یہی حال ان کے سفرنامہ "کوریا کہانی" "ایک مسافر چار ملک" "جرمنی نامہ" 1966ء اور "ماہ روز" (سفرنامہ روس) 1980ء کا ہے۔ سفری روداد قلم بند کرتے وقت حکیم صاحب "جرمنی نامہ" کے صفحہ نمبر 249 پر گوئٹے کا احوال رقم کرنا شروع کرتے ہیں اور پورے نو صفحے لکھ جاتے ہیں۔ یہ معلومات یقیناً سفر کی عطا نہیں:

حکیم محمد سعید نے ایک کام البتہ خوب کیا یعنی انہوں نے بچوں کے لئے حج نامہ / سفرنامہ لکھا۔ اور اس کام کو مسعود احمد برکاتی نے مزید آگے بڑھایا۔

سید وجاہت حسین کے چار سفرنامے "لندن کی سڑکیں سونے کی ہیں" "جب میں نے شاہ کا ایران دیکھا" "جب میں نے لینن کا روس دیکھا" اور جب میں نے کویت دیکھا" کتابی صورت میں شائع ہونے سے قبل روزنامہ انجام "کراچی" "سیارہ ڈائجسٹ" لاہور' ہفت روزہ "اخبارِ جہاں" کراچی' رانشے پوسٹ (مغربی جرمنی) جزیرۃ العرب (عراق) اور تہران جنرل (ایران) میں 1967ء سے اپریل 1970 کے عرصہ میں قسط وار شائع ہو چکے ہیں' لیکن ان سفرناموں کو ملک ملک کے جغرافیے' تاریخ اور فلسفیانہ موشگافیوں نے کسی حد تک نقصان پہنچایا ہے۔ یہی حال حسن رضوی اور سجاول خان رانجھا کے سفرناموں کا ہے۔
پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا سفرنامہ "پشکن کے دیس میں" (طبع اول 1986ء) اپنی بنت اور علمی و ادبی فضا بندی کے حوالے سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ انہوں نے سوویت یونین کے تاریخی' نیز علمی و ادبی اداروں اور شخصیات کی اتنی عمدہ تصویر کشی کی ہے کہ داد دیئے بغیر نہیں رہا جاتا۔ نمونہ تحریر ملاحظہ ہو:

"اس روز کریملن کی سیر اور لینن کے مقبرے پر جانے کا پروگرام تھا۔ دونوں ہی ہوٹل سے ڈیڑھ قدم پر تھے۔ سڑک کے اس پار پہلے لینن کے مقبرے کو دیکھنے کا ارادہ کیا پہنچے تو کیو کی لمبائی کو دیکھ کے میں حیرت زدہ رہ گیا۔ کیو سارے ریڈ اسکوئر سے ہو کے الیگزینڈر پارک میں نظروں سے غائب ہو رہا تھا۔ ایک میل سے کم اس کی لمبائی کیا ہو گی اور پھر یہ بھی نہیں کہ ایک فرد کے پیچھے دوسرا فرد ہو۔ کیو کی چوڑائی دو اور بعض جگہوں پر تین

افراد پر مشتمل تھی۔ اس کیو میں اگر سب کے پیچھے کھڑا ہونا پڑتا تو اس روز مقبرے میں داخل ہونے کی باری آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ الیگزینڈر نے دو ایک ملیشیا افسروں سے کہا کہ یہ ہندوستان سے آئے ہوئے شاعر ہیں اور سوویٹ رائٹرز یونین کے مہمان ہیں۔ ان افسروں نے مجھے مقبرے کے قریب ہی کیو میں ایک جگہ کھڑے ہونے کی اجازت دے دی۔ یہ رعایت غیر ملکی مہمانوں کو اکثر مل جاتی ہے۔ خود روس میں ایک طبقہ ایسا ہے جسے لینن کی زیارت کرنے کے لئے اس سے بھی زیادہ رعایت حاصل ہے اور وہ دلہنوں کا طبقہ ہے۔ ہر نئی بیاہی لڑکی اپنا فرض سمجھتی ہے کہ پہلے ہی دن لینن کے مقبرے پر جائے۔ ان کے لئے کیو میں کھڑا ہونا ضروری نہیں ہے یہ موٹر سے اتر کے اپنے شوہر کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے دوسرے رشتے داروں سمیت کیو سے بے نیاز ہو کر سیدھے مقبرے میں پہنچ جاتی ہیں۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ ہر ایک ڈیڑھ منٹ کے بعد ایک نیا بیاہتا جوڑا کیو سے الگ مقبرے کی طرف جا رہا ہے۔ ہاں مقبرے میں داخل ہونے سے قبل انہیں کیو میں شامل ہونا پڑتا ہے کیوں کہ مقبرے میں داخل ہونے اور باہر نکلنے تک خموشی کے ساتھ کیو میں چلنا ضروری ہے۔ مقبرے میں داخل ہوئے تو پہلے اندھیرے سے سابقہ پڑا۔ سیڑھیاں کافی نیچے اترتی چلی گئیں۔ پھر دوبارہ دائیں طرف کا چکر کاٹ کر اوپر سیڑھیاں چڑھنا شروع کیا۔ دو ایک سیڑھیاں چڑھے ہوں گے کہ بائیں طرف ایک پلیٹ فارم پر شیشے کے بکس میں لینن کی لاش محوِ استراحت نظر آئی۔ اوپر سے اس پر اتنی روشنی پڑ رہی تھی کہ چہرے کے تمام نقوش واضح تھے۔ صرف سر اور چہرہ گردن تک اور ہاتھ نظر آ رہے تھے۔ باقی جسم غالباً ایک پیتل کی چادر میں ڈھکا تھا۔ میں نے اس طرح سے لاش کو زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ بہت متاثر ہوا۔ باہر آئے تو مقبرے کے پیچھے کرے ملن کی دیوار کے ساتھ روس کے متعدد لیڈروں' جرنیلوں' عالموں اور شاعروں کی قبریں نظر آئیں۔ جو زیادہ بڑے لیڈر تھے ان کے مجسمے بھی قبروں کے اوپر بنے ہوئے تھے۔ اسٹالن کا مجسمہ بھی اس قبر کے اوپر روس کے بعض دوسرے لیڈروں کے ساتھ بنا ہوا نظر آیا۔

لینن کے مقبرے اور دوسرے عظیم روسی رہنماؤں کی قبروں کی زیارت کے بعد ہم لوگ کرے ملن میں داخل ہوئے۔ کرے ملن زار شاہی کے زمانے کی یادگار ہے۔ جس میں لینن ایک فاتح کے طور پر 12 مارچ 1918ء کو دن کے 12 بجے پوری پرولتاری شان کے ساتھ داخل ہوا۔ آج کرے ملن روسی کمیونسٹ پارٹی اور حکومت کے اہم ترین دفاتر سے آباد ہے۔ ماسکو اگر سارے روس کا دل ہے تو کرے ملن ماسکو کا دل ہے اور کرے ملن کو دیکھے بغیر ماسکو سے واپس

جانا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص راشٹر پتی بھون، سنٹرل سیکرٹریٹ اور لال قلعہ دیکھے بغیر دہلی سے واپس چلا جائے۔"

("بھگن کے دیس میں" طبع اول 1986ء از جگن ناتھ آزاد)

محمد حمزہ فاروقی کے دو ابتدائی سفر نامے بعنوان "زمان و مکاں اور بھی ہیں" مطبوعہ 1978ء اور "آج بھی اس دیس میں" (مطبوعہ 1982ء) اردن لبنان، آسٹریا، یوگوسلاویہ، ترکی اور ایران (زمان و مکاں اور بھی ہیں) اور اسپین (آج بھی اس دیس میں) سے متعلق ہیں۔ اس کے باوجود کہ ان سفر ناموں میں مشاہدے کے ساتھ مطالعہ بھی اپنی بہار دیتا ہے لیکن زبان وبیان پر کامل دسترس دکھائی نہیں دیتی۔ محض دو مثالیں دیکھیے:

1- "رومیوں نے ایک پہاڑی کو تراش کر بڑے بڑے پتھروں کو جوڑ کر لسیم بنایا تھا۔"

(زمان و مکاں اور بھی ہیں ص 25)

2- "میں سوچ رہا تھا کہ وہ بھی کیا دور ہوگا جب قافلہ حسینؑ کربلا کے میدان میں لٹ چکا تھا۔" (ص 66)

محمد حمزہ فاروقی کا تیسرا اور تاحال آخری سفر نامہ "سفر آشوب" کے عنوان سے سامنے آیا۔ یہ ایک عمدہ کوشش ہے۔

مسعود سلطان لکھیر کا "گوشہ وطن بریں" (مطبوعہ 1981ء) وادی کیلاش تک کے سفر کی روداد ہے۔ یہ سفر نامہ وطن کی محبت سے سرشار ہو کر لکھا گیا لیکن میں بھی زبان وبیان کی خامیاں کھٹکتی ہیں۔ کاش مسعود سلطان اپنے وطن کے مختلف گوشوں کی سیر وسیاحت کرتے ہوئے تاریخ کے مطالعے کا ثبوت بھی فراہم کر سکتے اور بجائے میونسپل کمیٹیوں کے سائن بورڈ پڑھنے کے مقامی لوگوں سے بات چیت کر لیتے۔ اٹک کے قریب "تخت بائی کے مقام کو وہ "تخت بھائی" لکھتے ہیں (ص 67)

ہنت ملی سر کے عنوان سے انہوں نے اٹک خورد کی سفری روداد رقم کی ہے لیکن (ص 49) پر اٹک جیسے تاریخی مقام کے ذکر میں اٹک قلعہ بیگم سرائے سے ملحقہ مغل کنواں، ہندوؤں کے قدیم مندروں اور کشتیوں والے پل کا حوالہ کہیں دیکھنے میں نہیں آیا جبکہ ان اہم مقامات کے ذکر کے بغیر اٹک سوائے ایک گزرگاہ کے کچھ نہیں۔

رومانی ناول نگار بشریٰ رحمٰن کے سفر ناموں میں رومانی اپروچ اور عمدہ فضابندی کے علاوہ نثر میں نظم کا مزہ ہے۔ بشریٰ رحمٰن، جو ادیبہ ہونے کے علاوہ سیاستدان ہیں اور پنجاب اسمبلی کے ممبر بھی رہ چکی ہیں، ان سفر ناموں میں اپنی تمام دلچسپیوں اور جہات کے ساتھ

دکھائی دیتی ہیں۔

"براہ راست" اور "تنک تنک دیدم ٹوکیو" بے شمار معلومات لئے ہوئے ہیں لیکن ان کی الگ شناخت کا وسیلہ بشریٰ رحمٰن کی زبان ہے۔ انہیں الفاظ کی نشست پر عبور حاصل ہے۔ اکثر نثر لکھتے ہوئے قوافی کا التزام پیش نظر رہتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ بشریٰ رحمٰن کے ان دونوں سفرناموں کی کھنکھناتی ہوئی نثر ہمیشہ جاذب توجہ رہی ہے۔

بشریٰ رحمٰن کا سفر نامہ/حجاز نامہ "تنک تنک دیدم ٹوکیو" جاپان، چین، انڈونیشیاء، ملائشیا، بھارت، ایران اور حجازِ مقدس کا سفری احوال ہے۔ کتاب کے آخر میں دو عنوانات قائم کر کے پورے سفرنامے کو حجاز نامے کی شکل دی گئی ہے۔

1- منزل عشق پہ تنہا پہنچے

2- مدینے کی گلیوں میں جو گن نبیؐ کی

پھر یہ کہ تقدیس کی فضابندی کرنے کو بشریٰ رحمٰن نے صوفیانہ کلام کا سہارا لیا۔ خاص طور پر خواجہ غلام فرید کا سرائیکی کلام والہانہ جذبات اور لطیف احساسات کا رنگ چوکھا کر دیتا ہے۔

خوبصورت نثر کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

"حج نجات کا وسیلہ بھی ہے، بخشش کا ذریعہ بھی گناہوں کی تلافی اور معافی کا بہانہ بھی، التجاؤں اور دعاؤں کی آماجگاہ بھی، مانگنے کا بہترین موقع بھی آنسو بہانے کا مناسب مقام بھی، ایمان وایقان کا ایک مستند عمل بھی۔ قول و فعل کی ایک شرعی ڈگر بھی اور زندگی کا خوبصورت ترین مگر کٹھن ترین مستقر بھی۔"

(ص346)

نثر میں شعر کا مزہ پیدا کرنے کی خواہش بشریٰ رحمٰن کی کامیابی بھی ہے اور واحد ناکامی کی صورت بھی۔ اب ایسا پیراگراف ملاحظہ ہو جس میں تحریر بے معنویت کی حدوں کو چھونے لگتی ہے۔

"سفر کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ سفر کی کئی رسمیں ہوتی ہیں کاروباری سفر، تفریحی سفر، تعلیمی سفر، مقصدی سفر، سیاسی سفر، مجبوری کا سفر، معالجے کا سفر، خریداری کا سفر، لاچاری کا سفر......"

("تنک تنک دیدم ٹوکیو" صفحہ 349)

پروین عاطف نے ملک ملک کی سیر کی۔ وہ بے پناہ مشاہدے کی حامل خاتون ہیں لیکن

ان کے سفر نامے "خوابوں کے جزیرے" کی سب سے بڑی خوبی آزاد خیالی ہے۔ وہ بات بے بات جھینپنے اور لجانے والی خاتون کبھی نہیں رہیں لہٰذا ان کے سفر نامے کو پڑھنے اور ان کے مشاہدات میں شریک ہونے کا ایک اپنا مزہ ہے۔ سفر نامے سے ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو :

"فلپائن میں وہاں کے لوگوں کے ساتھ بات چیت کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی کیونکہ وہاں "انگریزی کو جلا وطن کرو" جیسی کوئی تحریک ابھی تک نہیں چلی۔ ٹیکسی ڈرائیور پڑھا لکھا ذہین آدمی تھا' فوراً ہماری بات چیت سمجھ گیا۔ اللہ کا کرنا کیا ہوا کہ ٹیکسی والے کی مہربانی سے ہمیں نہایت مناسب دام پر نہایت آرام دہ جگہ مل گئی۔ انتظامیہ کی انچارج ہلکے صندلی رنگ کی' چھوٹی سی ناک والی کھڑ کھڑ ہنستی گڑیا سی تھی۔ کمرہ تو صرف میں نے ہی دیکھا۔ لڑکوں نے تو صرف اسے ہی دیکھ کر ڈھیریاں ڈھادیں۔ ہورے صاحبزادے نے تو اس کی آنکھوں میں جلتے قمقمے دیکھ کر ہکلانا شروع کر دیا۔

میں کمرے میں جا کر سو گئی تو وہ دونوں جانے کہاں کھسک گئے۔ شام پڑے واپس آئے تو دونوں کے رنگ لال گلال ہو رہے تھے۔ مسکراہٹیں پھوٹ پھوٹ پڑ رہی تھیں۔ کہنے لگے ' "چلئے سیر کریں۔"

("خوابوں کے جزیرے" از پروین عاطف)

جدید دور میں ایک سفر نامہ منظوم بھی لکھا گیا' اور وہ ہے یونس متین کا "ایک چکر میرے پاؤں میں۔" یہ اردو کا چوتھا منظوم سفر نامہ ہے۔ سجاول خان رانجھا کا "گھر کی تلاش" سفر نامے اور رپور تاژ کی ملی جلی صورت ہے' اور سفر یورپ کے حوالے سے لکھے گئے دیگر سفر ناموں سے قدرے مختلف۔ اسی طرح ڈاکٹر صابر آفاقی کا "کثرتِ نظارہ" کہیں پر تو خالص سفر نامہ دکھائی دیتا ہے اور کہیں رپور تاژ۔ "کثرت نظارہ" میں نیپال' بھارت' بنگلہ دیش' برما' تھائی لینڈ' ملائیشیا' ہانگ کانگ' مکاؤ' سنگاپور' اور سری لنکا کے سفری مشاہدات کے علاوہ وسطی ایشیا کی آزاد ریاستوں سے متعلق سفری احوال' نیز زرتشتیوں کے تہذیبی علاقہ جات' بدھ مت کے آثار و اثرات اور آزاد ریاستوں خصوصاً تاجکستان' قرغیزیہ' ازبکستان اور قازقستان کی طلسماتی فضابندی خاصے کی چیز ہے۔

مقامِ حیرت ہے کہ اردو کے پہلے سفر نامہ "تاریخ افغانستان" از سیّد فدا حسین عرف نبی بخش' مطبوعہ 1839ء تا "عجائبات امریکہ" مترجمہ منشی اللہ دتہ (مطبوعہ 1894ء) ہمارے ہاں مذہبی نوعیت کی روحانی وارداتوں پر مشتمل حجاز ناموں کے علاوہ اعلیٰ درجہ کے خالص سفر نامے خال خال ہی دکھائی دیتے ہیں۔ جب کہ پرانے ناموں میں میرزا ابو طالب اصفہانی کی استثنائی مثال کے علاوہ سر شیخ عبدالقادر سے مستنصر حسین تارڑ تک سفر نامے کی

صنف کے ساتھ مشرقی مزاج کی مطابقت بہت کم دیکھنے کو ملی۔

مستنصر حسین تارڑ نے اپنے تین ابتدائی سفرناموں "نکلے تیری تلاش میں" "اندلس میں اجنبی" اور "خانہ بدوش" میں "ڈان جوآن" بننے کی کوشش کی اور رفتہ رفتہ یہی حال عطاء الحق قاسمی کا ہوا۔

ان دونوں سفر نامہ نگاروں کے تصنیف کردہ سفر ناموں کو دیکھیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے لعبتان لندن و چین مدت مدید سے ہمارے ان "گھبرو جوانوں" کی راہ تک رہی ہوں۔ پھر' اس صنف کے مسلسل بگاڑ کی ایک صورت اور دیکھنے کو ملی' جب عطاء الحق قاسمی' امجد اسلام امجد' حسن رضوی' اجمل نیازی اور دیگر کمزور شعراء نے یورپ' امریکہ اور مشرق وسطیٰ کے متعدد شہروں میں اپنی ہی قبیل (از قسم حمیرا رحمٰن اور جمشید مسرور) کے لوگ ڈھونڈ نکالے' اور ان کی جعلی ادبی تنظیموں کے فراہم کردہ ہوائی جہاز کے ٹکٹوں' ضیافتوں اور خفیہ خدمات کے بدلے میں ہمارے سیاحوں نے حقِ نمک ادا کرتے ہوئے اپنے میزبانوں اور ان کے چوں کا ذکر اس انداز سے کیا کہ پڑھتے ہوئے شرم آتی ہے۔ حرام ہے کہ اس "کشکول گروپ" نے اپنی یورپ یا امریکہ کی کسی سفری روداد میں پروفیسر رالف رسل' ڈاکٹر داؤد رہبر' آغا بابر' ڈاکٹر کرسٹوفر شیکل' محمد عمر میمن اور چودھری محمد نعیم جیسے سنجیدہ قلم کاروں سے ملاقات کا ذکر کیا ہو۔

ان سفر ناموں میں روا رکھی گئی انتہا درجہ کی مبالغہ آرائی اور تخیل کی من مانیوں نے سفر نامے اور فکشن کی حد بندیاں توڑ کر رکھ دیں۔ اس کے نتیجہ میں ان کی کتابیں "بیسٹ سیلر" تو یقیناً ثابت ہوئیں' لیکن سفر نامے کی سچائی اور ایمانی فیصلوں پر کاری ضرب لگی۔

اس کے برعکس بعض خواتین کے لکھے سفر ناموں میں شامل صلح کل کے رویئے کے ساتھ خالص نسوانی اپروچ' خالصتاً نسوانی حوالوں کے ساتھ نفسیاتی اور سوشوپولیٹیکل تجزیہ نگاری' نیز نسوانی زبان اور خواتین سے مخصوص محاوروں کے ساتھ متنوع طاقتور اسالیب بیان نے اس "شگفتہ بیانی محض" کے روز بروز تنگ ہوتے ہوئے حصار کو توڑنے کا جتن کیا ہے' جس نے بیگم اختر ریاض الدین اور ابن انشاء سے اردو کے جدید تر سفر نامہ نگاروں تک آتے آتے آکاس بیل کی شکل اختیار کر لی تھی اور یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے اردو سفر نامہ رفتہ رفتہ اوٹ پٹانگ مزاح نگاری کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔

مجمل طور پر بات کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ خالص سفر نامے کے اجزاء کو ہمارے یہاں اس طرح نہیں سمیٹا جا سکا کہ سفر نامہ ایک نرول تخلیقی اظہار بن پاتا۔ نیز اس سمت کے تعین کی ضرورت تا حال محسوس کی جاتی ہے' جو اردو سفر نامے کا بطور ایک ادبی صنف کے مزاج متعین کر سکے۔

حواشی و حوالہ جات

1- دیکھیے قسط وار مضمون : کچھ یوسف کمبل پوش کے بارے میں مطبوعہ روزنامہ "نوائے وقت" راولپنڈی مورخہ :14 فروری 1984ء' 21 فروری 1984ء اور 28 فروری 1984ء

2- طبع اول : میرٹھ 1884ء حضرت سید غوث علی شاہ قلندر پانی پتیؒ (1804-1880) کے ملفوظات اور احوال و آثار سے متعلق دستاویز۔

3- "مذہبی تہذیب' جدید تہذیب اور ادب" از سلیم احمد 'مشمولہ "نئی نسلیں" کراچی' ستمبر 1978

4- حوالہ : "حیاتِ جاوید" مطبوعہ لاہور اکادمی پنجاب لاہور' 1957ء ص 629

5- دیکھیے کتاب : "جدیدیت" از محمد حسن عسکری' مطبوعہ 'آبِ حیات "راولپنڈی 1979ء ص 49

6- دیکھیے مکتوب بنام شمس الرحمٰن فاروقی۔ مشمولہ : مجلّہ "روایت" لاہور 1983ء

اورینٹ پبلشرز کی دیگر ادبی کتب

1۔ تنقیدی نظریے	ڈاکٹر ملک حسن اختر
2۔ جعفر علی حسرت (سوانح کلام)	ڈاکٹر شبیر احمد علوی
3۔ افسانے کے پانچ رنگ	ڈاکٹر مرزا حامد بیگ
4۔ افسانے کا منظر نامہ (اُردو افسانے کی مختصر تاریخ)	ڈاکٹر مرزا حامد بیگ
5۔ اررو ادب کی شناخت (تنقید)	ڈاکٹر مرزا حامد بیگ
6۔ عالمی کلاسیک	ڈاکٹر مرزا حامد بیگ
7۔ اُردو افسانے کے معمار	ڈاکٹر اسلم عزیز درانی
8۔ جہانگیر اور علم الحیوانات	ڈاکٹر اسلم عزیز درانی
9۔ تائید	پروفیسر غلام حسین ساجد
10۔ اُردو ادب۔ بیسویں صدی میں	پروفیسر غلام حسین ساجد
11۔ اُردو شاعری کلاسیکی عہد میں	پروفیسر غلام حسین ساجد
12۔ اصناف ادب اُردو	ڈاکٹر تنویر حسین
13۔ مزاج بخیر (طنز و مزاح)	ڈاکٹر تنویر حسین
14۔ امراؤ جان ادا (ناول: مرزا سوا) (تنقید و تبصرہ)	ڈاکٹر تنویر حسین
15۔ خورشید حرا (نعتیہ مجموعہ)	رفیع الدین ذکی قریشی
16۔ عناصر (شعری مجموعہ)	پروفیسر غلام حسین ساجد
17۔ صدائے فقیر (پنجابی شعری مجموعہ)	ڈاکٹر فقیر محمد فقیر
18۔ مہکدے پھل (پنجابی شعری مجموعہ)	ڈاکٹر فقیر محمد فقیر
19۔ بابائے پنجابی تے حق اللہ	پروفیسر جنید اکرم
20۔ تصوف نفسیات اور سائنس	محمد رمضان فاروقی

مرزا حامد بیگ کی دیگر کتب:-

افسانے:

1- گمشدہ کلمات
2- تار پر چلنے والی
3- قصہ کہانی
4- گناہ کی مزدوری
5- لاکر میں بند آوازیں
6- حمیدہ کی کہانی
7- جانکی بائی کی عرضی

تنقید:

8- افسانے کا منظر نامہ
9- تیسری دنیا کا افسانہ
10- اُردو ادب کی شناخت
11- مقالات
12- نسوانی آوازیں

ترجمہ:

13- نرناری

مُرتبہ:

14- باغ و بہار: نسخہ کلکتہ
15- ظواہر السرائر: تذکرہ

تحقیق:

16- عزیز احمد: کتابیات
17- اُردو اور صوفی ازم
18- کتابیات تراجم: علمی کتب
19- کتابیات تراجم: نثری ادب
20- ترجمے کا فن
21- مغرب سے نثری تراجم
22- اطالیہ میں اردو
23- اُردو ترجمے کی روایت
24- اُردو افسانے کی روایت
25- اُردو کا پہلا افسانہ نگار: راشد الخیری
28- مصطفیٰ زیدی کی کہانی
27- ٹی۔ ایس ایلیٹ

لیکچرز:

28- عالمی کلاسیک